معارف

اپریل ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۱ء عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ملک عزیز کو استعماری قوت کی سب سے بڑی علامت برطانیہ کی شہنشاہیت سے آزاد ہوئے ستر برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، اب اس کے پچھتر سال ہونے کو ہیں، اس موقع کو مرکزی حکومت نے آزادی کے جشن کے لیے منتخب کیا اور اس کا باضابطہ افتتاح وزیر اعظم نے احمد آباد میں کر بھی دیا، ''آزادی کا امرت مہوتسو'' کے نام سے اس ملک گیر جشن کو موسوم کیا گیا، اس کے ذریعہ آزادی کی جدوجہد، نظریات، حصولیابیاں، عمل اور عزائم کے نام سے پانچ حصوں کے مرکزی موضوعات بتا کر جشن کے رخ اور مقاصد کی بھی گویا تعیین کر دی گئی، وزیر اعظم کی الفاظ پر قدرت اور پھر جملوں میں ان کے استعمال کی مہارت اب ڈھکی چھپی چیز نہیں، اس جشن کے افتتاح پر بھی اسی صلاحیت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب انہوں نے امرت اتسو کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد آزادی کی توانائی کا امرت ہے، اس آب حیات میں نئے خیالات اور نئے وعدوں اور خود انحصاری کے اجزا بھی شامل ہیں۔

نئے خیالات، نئے عزائم، نئے عوامل اور نئے وعدوں کے جملے اور جلوے موجودہ حکومت کی سات سالہ مدت کی کارکردگی کا سب سے نمایاں عنصر ہیں، جدید ہونے اور جدید دکھائی دینے میں جتنا زور موجودہ حکومت میں صرف ہوا، یقیناً اس سے پہلے قریب ساٹھ پینسٹھ سال کی حکومتوں میں مجموعی طور پر نظر نہیں آتا، لیکن قدیم ترین نظریات اور اساطیری روایات پر یقین رکھنے والوں کے لیے اب تک یہ عمل مشکل ہی رہا کہ جدید و قدیم کے امتزاج کو ملک و قوم کے لیے نافع بنایا جائے، آزادی کے لیے قربانیاں دینے والوں، اس جدوجہد کی آگ میں جھلسنے والوں اور نظریات کی پاسداری کرتے ہوئے دار و رسن سے ہم کنار ہونے والوں کی تاریخ ایک حقیقت ہے لیکن ان کے ساتھ موجودہ حکومت اور اس کی جماعت اور اس کے سرچشمۂ نظریات کا جو رویہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جاری رہا، وہ بھی اصحاب نظر کے سامنے ہے، ایسے میں ان اندیشوں اور خدشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آیا یہ جشن، آزادی کی جدوجہد کی واقعی تصویر پیش کر سکے گا اور شہیدان آزادی اور ان کی قربانیوں کا صلہ بھی متعین کر سکے گا؟ تعصب، تنگ نظری اور حقائق سے چشم پوشی کا ماحول بنانے والے کس طرح اس دور

کی سچی تصویر کشی کر سکیں گے، جس دور میں خود حکمراں جماعت کے بانیوں کے چہروں پر ایسے داغ نظر آتے ہیں جو کسی بھی تصویر کو بدنما کر سکتے ہیں۔

اندیشے خواہ کیسے بھی ہوں لیکن اگر یہ موقع ہے کہ آزادی کی تحریک اور اس کے لیے بے مثال قربانی دینے والوں اور ان کے مقصد اور غرض وغایت کا سنجیدگی سے مطالعہ اور مذاکرہ کیا جائے تو اس موقع کا صحیح استعمال افادیت سے خالی نہ ہوگا، یہ ایک بار پھر گمراہی کا شکار ہونے والوں اور تاریخ کے نام پر مسموم اساطیریات کا نشانہ بننے والوں کے سامنے اصل تاریخ کے مٹتے نقوش کو زندہ کرنا ہوگا، ان کو ۱۸۵۷ء کے بعد اور اس سے زیادہ اس سے پہلے کے ان واقعات ولمحات کو سامنے رکھنا ہوگا اور اس حقیقت سے پردہ اٹھانا ہوگا کہ جنگ آزادی شروع کرنے والے وہی تھے جو آج خاص طور پر حکومت کا تختۂ مشق ہیں، ایک انگریز سیاست داں ڈاکٹر ولیم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے خاتمہ پر برطانوی وائسرائے کو لکھا تھا کہ "ہندوستان کی جنگ آزادی صرف مسلمانوں نے لڑی ہے"، اس ایک جملہ کی تائید میں ٹیپو سلطان سے بہادر شاہ ظفر تک ایک طویل سرخ لڑی ہے، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور سید احمد شہید، مولوی احمد اللہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، لیاقت علی الٰہ آبادی، پیر علی، مفتی عنایت کاکوری، جنرل بخت خاں، جہاں بخت، بیدار بخت، واجد علی شاہ، بیگم حضرت محل، کرامت علی جونپوری ایسے خدا جانے کتنے نام ہیں جو اس سرخ لڑی میں یاقوت کی طرح پروئے ہوئے ہیں، جشن آزادی کے سچے نقوش کی تب وتاب جاودانہ دکھانے کا واقعی جذبہ ہے تو ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ کے ان صاحبانِ عزیمت کی داستان عظمت کے لیے کچھ حصہ الگ کیا جانا کیا ضروری نہیں؟ یہ وہی صاحبانِ عزیمت تھے جن کے خون کے قطروں سے ہندوستان کی زمین پر آزادی کی دوسری فصل لہلہائی، سرسید، شیخ الہند مولانا محمود حسن، برکت اللہ بھوپالی، مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ نے انڈمان نکوبار کے کالے پانی کو مالٹا اور امریکہ اور جاپان تک کیسے موجزن کیا اور پھر شبلی وحالی، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور علماء ومشائخ کی نہ ختم ہونے والی فہرست میں شامل بے شمار ناموں نے جس طرح قید وبند کے شدائد اور آزمائشوں کی داستانیں لکھیں، کیا ان کو یہ حق نہیں کہ آب حیات وحریت میں ان کا بھی حصہ ہو؟ جمعیۃ العلماء، جمعیۃ الانصار، حزب اللہ، مجلس احرار، کیسی کیسی جماعتیں، جان ودل سب نثار کرتی رہیں، جمعیۃ العلماء نے مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا، اس

کی بازگشت کیوں قید کردی جائے ،مولانا آزاد، مولانا مدنی، مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، کیا ان کے ذکر کے بغیر آب حیات وحریت میں کوئی لطف ولذت ہے؟ اور سب سے بڑھ کر وہ محمد علی جوہر جو بیجاپور جیل میں اپنی مجبور ومدقوق بیٹی کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے تڑپتے رہے لیکن آزادی کے اس جیالے نے غاصب حکومت کے سامنے درخواست کی ذلت نہ اٹھائی، بس یہی کہتے رہے کہ ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

وہی محمد علی جنھوں نے غاصب حکومت کی راجدھانی میں جاکر اعلان کردیا کہ میں اپنے ملک اس حالت میں واپس جاؤں گا جب آزادی کا پروانہ میرے ہاتھوں میں ہو، میں ایک غلام ملک میں مرنا بھی پسند نہیں کرتا، میں ایک غیر مگر آزاد ملک میں مرنا پسند کروں گا، آپ مجھے آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینا پڑے گی ، یہ تب تھا جب کچھ عناصر شدھی اور سنگھٹن کی مہم چلا رہے تھے، آزادی کی کہانی سنانی ہے تو پھر معرکہ آرائیاں کی داستانیں اور بھی ہیں، حسرت موہانی کی شخصیت آج گویا گمنام ہے لیکن کبھی ان کو صحیح معنوں میں انگریزی حکومت کا باغی کہا گیا تھا، اس حکومت کو غیر فطری انھوں نے ہی کہا، مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول آزادی کی جنگ میں علامہ شبلی خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے لیکن حسرت پہلے ہیں جنھوں نے جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلیٰ ادب کے ساتھ سیاست کا صحیفہ بن گیا، وہ بار بار گرفتار ہوتے رہے اور بقول مولانا آزاد ''اللہ نے حسرت کو مقام یوسفی کے کامل اتباع کی توفیق دی'' لیکن کیا واقعی موجودہ حکومت اس جشن میں ان سرفروشوں کو یاد کرے گی؟ جواب جو بھی ہو لیکن جس قوم سے یہ منسوب ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ہر سطح پر یہ یاد دلائے کہ آزادی ہمارے اسلاف کا کارنامہ ہے تو اس کی بقا اور تحفظ اب ہمارا فرض ہے، قربانی دونوں میں قدر مشترک ہے، آزادی کا پچاسواں جشن ہو یا صد سالہ، ہر موقع پر ہم کو اپنے اسلاف کی یاد آنی ہی چاہیے

اس مہینے ایسی خبریں آئیں جو پوری امت مسلمہ سے دعاؤں کا تقاضا کرتی ہیں، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ سخت علیل ہیں، پھر بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا ولی رحمانی کے آئی سی یو میں جانے کی خبر ملی، ندوہ کے نائب ناظم مولانا سید محمد حمزہ حسنی بھی اسپتال میں داخل ہوئے، یہ سب ملت کا سرمایہ ہیں، ان کی صحت وسلامتی کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

مقالات

فکر اقبال کے عصری حوالے

پروفیسر عبدالحق

انیسویں صدی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ عبقری انسانوں اور دانش وروں کی ایسی کہکشاں کسی اور صدی میں موجود نہیں ہے۔ وہ یورپ ہو یا ایشیا۔ مردانِ ہنرمند کا ایسا اجتماع تاریخ عالم میں نظر نہیں آتا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں فکر و عمل کا انقلاب آفریں چشمہ رواں ہے۔

اس عہد کو آفریں باد کہتا ہوں کہ اس نے عہدِ گل کے ایک فرزانے کو جنم دیا۔ اقبال راہِ کہکشاں میں کرمک شب تاب تھے۔ اس دور کے دوسرے شہہ سواروں کے برعکس انھوں نے اپنے لیے فکر و فلسفہ جیسے اہم موضوعات کو پسند کیا۔ یہی ان کی پیشانیٔ جمال کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ تاریخ کے مسلمات آئے دن کی تحقیق سے مفروضات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سائنس بھی شان وجود کے ہر لمحہ کے انکشاف سے علم بے رطب ثابت ہوتی رہتی ہے۔ مگر فکر انسانی کی یافت کا سلسلۂ روز و شب برقرار رہتا ہے۔

یہ صدی فکر و فلسفہ کے ساتھ سخنوری اور سخن شناسی کا بھی عہد نشاط ہے جو فکری سطح پر تضادات اور آویزشوں سے خالی نہیں ہے۔ چشمِ زدن میں بساطِ زندگی کا بدل جانا، ناآشنا اور ناقبول قیادت کا مسلط ہوجانا بڑا سوہانِ روح تھا۔ ہزاروں سال کے رچے بسے اقدار سے دست بردار ہونا بھی ممکن نہ تھا۔ تاریخ عالم میں ایسی تہذیبی کشاکش کی مثال شاید ہی موجود ہو۔ تقریباً ایک صدی بعد آج ہم جس آزمائش سے دوچار ہیں، اگر نگاہ شریک بینائی ہو تو اس دور کے اضطراب کو محسوس کرسکتے ہیں، طرزِ کہن پر اڑنے اور آئین نو سے ڈرنے کو منزلِ مراد تک پہنچنے کے لیے سنگِ راہ قرار دیا گیا ہے۔ نفسیاتی آشوب اور فکری سراسیمگی کے دور میں فکری و ذہنی رویوں کا بدل جانا فطری تقاضوں کے تابع ہوا کرتا ہے، پورے دور کو دیکھیے تضادات کے عجائب گھر پناہ گاہوں سے آباد ہیں۔ ملک مغربی استعمار و اقتدار کے

☆ ۱۵ ۲۳ ـ ہڈسن لائن، کنگسن وے کیمپ، دہلی ـ ۹، موبائل: ۹۳۵۰۴۶۱۳۹۴ ـ

زیرنگیں تھا۔ابن خلدون نے مقدمہ میں ایک نکتہ بیان کیا ہے کہ محکوم خواہ کتنی بڑی اکثریت کا مالک کیوں نہ ہو وہ اقل ترین اقتدار کی تہذیب وتمدن کو اختیار کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔مغلوب معاشرے کے لیے دینِ تثلیث کی تبلیغ بھی مشرقی مذاہب اور عقیدے کے لیے کسی زلزلے سے کم نہ تھی۔اقبال نے قلب ونظر کی کرب ناک کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

تاریخ وتہذیب کے ساتھ مغربی طرزِ زندگی کو بہرصورت ترجیح دی جارہی تھی۔اس سیلِ بے اماں کو روکنے کے لیے مذہب اور ماضی کا سہارا ہی مداوا سمجھا گیا اس عہد کی بیشتر علمی کاوشیں اسی سبب سے وجود میں آئیں۔زیادہ تر مصنّفین علم دینی سے کماحقہٗ بہرمند نہ ہونے کے باوجود مذاہب کی طرف مائل تھے۔دوسری طرف علم تاریخ میں اختصاص نہ رکھنے کے باوجود تاریخی تالیف انجام دے رہے تھے۔سرسید نے بھی تاریخ کے ساتھ تفسیر وسیرت رسالتِ مآبؐ کے ساتھ اپنا شوق وشغف باقی رکھا۔سرسید کا یہ نعتیہ شعر بے سبب نہیں ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم مسیحا رشک می دارد بہ درمانے کہ من دارم

یا حالی کا مشہور نعتیہ شعر درونِ دہر کی زبان کا برملا اظہار ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

انگریزی زبان میں ''صحرانشینوں کی تاریخ'' بھی اس ذہنی کشمکش کی تصویر ہے۔تقریباً ہر ذی فکر انسان مذہبی حوالوں سے اپنے اپنے خیال کی وضاحت کررہا تھا۔گاندھی جی کو رام راج میں اماں ملی، پنڈت نہرو کو تلاشِ ہند کے وسیلے سے ماضی میں دلکشی دکھائی دی۔ڈاکٹر رادھا کرشنن فلسفۂ ہند کے امتیازات قلم بند کرنے میں مشغول ہوئے۔دوسری طرف علامہ مشرقی، مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالکلام آزاد قرآن پاک کے تفسیر وترجمہ پر متوجہ ہوئے۔شبلی نے تفسیر وحدیث کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔سیرۃ النبیؐ کے ساتھ شعروادب کے آفتاب عالم تاب قرار دیے گئے۔مولانا محمد حسین آزاد، حالی اور نذیر احمد بھی (ترجمۂ قرآن سے قطعِ نظر) ادب وانشا اور انتقاد میں مہرو ماہ تسلیم کیے گئے۔ انتہا یہ ہے کہ یہ ناموران ادب تخلیق کی دارائی یا ملک الشعرائی سے ملقب نہ ہوسکے۔اس کے برعکس شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔خود اقبال کا معاملہ بھی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔وہ کسی دینی

درس گاہ سے فارغ نہ تھے مگر مسائلِ دینی میں عبقری نظر کے مالک تھے۔ تفکیرِ دینی کی ترویج ہی ان کی آرزوئے حیات تھی۔

یہ حضرات اردو ادب کے نغمۂ نو بہار کی بشارت بھری آواز کے موجب بنے۔ ان بزرگوں کی ثروتِ علمی میں ادب ایک جوئے رواں کی طرح جاری ہے۔ اقبال کے فلسفۂ وشعر کے مذہبی اظہار کے محرک و مآخذ یہی معاصر فکری رویے ہیں۔ جو اقبال جیسے عبقری ذہن کے لیے بڑی کشش رکھتے تھے یہ عام انسانی نفسیات کا کلیہ ہے کہ مصائب ومشکلات میں غیبی قوت اور ایمان ویقین میں نجات کی رہ گزر دکھائی دیتی ہے۔ بہ نظر غائر دیکھیں تو انیسویں اور بیسویں صدی کی عام فضا مذہبی افکار کے تلاطم سے دوچار رہے۔ اس میں مفاہمت اور منافرت دونوں کے آثار کارفرما ہیں۔ اگرچہ بوجوہ مثبت رویے اور رواداری کا پہلو غالب ہے۔ فکرِ اقبال نے اثبات واشتراک کا انتخاب کیا۔

محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی

ان کا یہ اقرار ہر سو اور ہر سمت نظر آئے گا۔ رموزِ بے خودی میں مقصدِ رسالت کا جلی عنوان ہے۔ ''مقصود رسالتِ محمدیہ تشکیل وتاسیسِ حریت ومساوات واخوت بنی نوع آدم است۔''

ان اشعار کی حکیمانہ بلاغت ملاحظہ ہو:

برطریقِ مصطفی محکم پئے نغمۂ عشق ومحبت را نئے

عاشقی محکم شود از تقلید یار تا کمندِ تو شود یزداں شکار

محبت کا یہ جذب وشوق فکر وفلسفہ کو متحرک کرتا ہے۔ خودی محبت ہی سے محکم ومنور ہوتی ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود

گویا خودی محبت سے جلوہ نما ہوتی ہے۔ اس محبت کا سر رشتہ رسالت مآبؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

ہستیٔ مسلم تجلی گاہِ او طور ہا بالد ز گردِ راہ او

اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ گویا بیش وکم کے ساتھ ۱۹ویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں وہ جواں ہوئے۔ اس دوران شعور میں بالیدگی پیدا ہوئی اور اس صدی کے حادثات سے بھی آگہی حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی کے اڑتیس سال کے نشیب وفراز سے وہ دوچار ہوئے۔ اس مدت کو ملاحظہ فرمائیں تو اندازہ ہوگا کہ دنیا میں کئی انقلاب رونما ہوئے۔ جسے شاید ہماری تاریخ قلم بند کرنے سے

قاصر رہی۔ سرحدی اور خانہ جنگی سے لے کر عالمی جنگ میں بنی نوع بشر وجود کی بقا کے لیے نبرد آزما تھا۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کو لوحِ تقدیر کی تحریر سمجھ چکا تھا۔ ان حالات میں علم و اقدار کے ساتھ تخلیق و تعبیر کے پیمانے بھی استحکام سے محروم نظر آتے ہیں۔ یورپ سے نفرت کا جذبہ سینوں میں تلاطم خیز تھا۔ مگر دوسری طرف اس کی تہذیب و ادب کی برکتوں سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ طرزِ کہن پر اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کی کشمکش سے ہر ہندوستانی ہراساں تھا۔ بھلا ہو سرسید کے رفیقوں کا جنھوں نے آشوب زدہ معاشرے کی رہنمائی کی۔ اصلاحی تصورات نے ہمت بندھائی اور جینے کے آداب سکھائے۔ مغربی اقتدار کے ساتھ ان کی پامال قدروں سے پرہیز کرنا سکھایا تو صحت مند افکار کو اپنانے پر زور دیا۔ ایسی کشاکش میں ادب کا نظام اصلاح و تربیت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پرانے ادبی معیار سے انحراف کا رویہ اس دور میں ایک عام رجحان بن چکا تھا۔ تقریباً سبھی لوگوں نے نئے مثبت اور تعمیری تخلیق کو فروغ دینے کے امکانات روشن کیے۔ نظم و نثر کے موضوعات اور اسالیبِ بیان کے تقاضے ایک چیلنج بن کر ابھرے۔ سرسید کی نثر کو لیجیے۔ نذیر احمد کی اصلاحی تحریروں کو پیش نظر رکھیے۔ حالی و شبلی کے نگارشات پر نظر ڈالیے تو محسوس ہوگا کہ موضوع اور طرزِ اظہار میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ موضوعاتی نظموں یا شاعری کا چلن ہوا تو تاریخ و سوانح، تنقید و سیرت نگاری کے ساتھ ناول و افسانہ، فکر و فلسفہ نے بساطِ ادب کو بدل دیا۔ یہ تمام تبدیلیاں انحراف و اقرار سے ہم آغوش بھی تھیں۔ ایسی فضا میں اقبال کی پرورشِ لوح و قلم ہوئی۔ فکر و نظر کا سفینہ بھی رواں دواں ہوا۔ اس ادبی رجحان یا پیش نامے کو سامنے رکھیں تو اقبال کے تصورات کی تفہیم آسان ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ان کے فن کا تجزیہ اور تحسین بھی منصفانہ ہو سکے گا۔

اقبال بے حد ذہین تھے اور بے انتہا حساس بھی۔ اس شدت احساس کا اظہار ان کی تخلیقات میں بہت نمایاں ہے۔ یہی ان کو تخلیق کے لیے مہمیز کرتا ہے اور اچھی سے اچھی تخلیق کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور اسی احساس نے ان کی شاعری کو عصری تاریخ کا ایک تخلیقی مرقع بنا دیا۔ اس اعتبار سے بھی دنیا میں کوئی دوسرا شاعر ان کا حریف نہیں۔ وہ اپنے دور کے ہر واقعے یا حادثے سے متاثر ہوتے رہے اور یہی تاثر ان کی تخلیق کا باعث بنتا رہا۔ گویا ان کی شاعری اس دور کے اندرونی اور بیرونی واقعات کی مرہون ہے۔ اچھے فنکار کی شناخت بھی یہی ہے کہ اس کے یہاں احساس کی فراوانی ہو۔ تصویر درد،

شکوہ، خضرراہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق ۔ یہ ساری طویل نظمیں اپنے پس منظر میں تاثر آفرینی کا بے پایاں احساس رکھتی ہیں۔ اسی شدتِ احساس نے انہیں زود حس بنادیا تھا۔ قومی معاملات ہوں یا بیرونی، سیاسی ہوں یا مذہبی۔ حد ہے کہ وہ فکری معاملات میں بھی بہت جلد اس کی زد میں آجاتے تھے۔ ان کے فکری تضادات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ متضاد قسم کے افکار کو پسند کرتے ہیں۔ مارکس اور مسولینی کے افکار یکجا نہیں ہوسکتے مگر اقبال ایک طرف معاشی نظام سے متاثر ہیں اور لبیک کہتے ہیں تو دوسری طرف ندرتِ فکر وعمل اور آنکھوں کی چمک پر فریفتہ نظر آتے ہیں۔ انہیں کوئی نکتہ، کوئی پہلو اور ادنیٰ سی بات بھی متاثر کرسکتی ہے۔ وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس زود حسی کے ساتھ وہ زود رنج بھی ہیں۔ ان کی اس زود حسی نے غلط فہمی بھی پیدا کی۔ وہ نرم دل اور نرم خو تھے۔ بیرونی حوادث یا واقعہ سے حساس طبیعت کا متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ سنگ دل ہی بے نیاز ہوتے ہیں اور پھر قلبِ شاعر تو مجموعہ احساس ہوتا ہے۔

اقبال بے حد حساس ذہن کے مالک تھے۔ معمولی واقعات بھی ان کے قلب ونظر میں ہلچل پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ ان کے تخلیقی ذخیرے کو دیکھئے جو واقعات یا حادثات کے حوالوں سے بھرپور ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تمام تحریریں اپنے عہد واحساس کی تاریخ ہیں۔ اقبال کے کلام کی ایک بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ انہوں نے عصری محسوسات یا رونما ہونے والے واقعات کو شعری اظہار بنادیا ہے۔ تاریخ یا عصری احساسات کا ایسا نمونہ اردو کیا دوسری ادبیات میں مشکل سے ہی ملے گا۔ ملک ہی نہیں دنیا کی نصف صدی کی تاریخ کا اشاریہ اقبال کے اشعار میں بہ سہولت مل جائے گا۔ ان کا کلام اپنے عہد کا ترجمان ہی نہیں ایک طرح کا جامِ جہاں نما بھی ہے۔ جس میں مکروہ وزشت تصویریں محفوظ ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اقبال پہلا شاعر ہے جس نے ہندوستانی ادبیات میں کرۂ ارض کے اضطراب و کشاکش کی ترجمانی کی ہے۔ انقلابِ روس، جنگِ طرابلس، چین کی گراں خوابی سے بیداری، جوانانِ تتاری کا جوش وخروش، طوفان مغرب سے مسلم قوم کی حرارت، مغربی دنیا کے دگرگوں ہونے کی کہانی، جمعیتِ اقوام کی جنگِ زرگری، جاپان کی صنعت گری کے ساتھ دجلہ ودینوب ونیل کی موجوں کا اضطراب کلامِ اقبال میں بے پردہ دیکھا جاسکتا ہے۔

اقبال کے شہرعزیز کی سرحدوں کے قریب اسلامی اشتراک واتحاد کی الہامی آواز فضائے دشت

میں بانگ رحیل بن کر گونج رہی تھی۔ یہ انقلاب آفریں اعلانیہ تھا جو بین المسلمین تحریک کی صورت اختیار کر چکا تھا، اقبال اس سے مانوس ہی نہیں متاثر بھی تھے، جس کا اعتراف جاوید نامہ میں طاسین محمدؐ کے بعد فلک عطارد پر سید السادات جمال الدین افغانی کے تذکرے سے عنوان کا آغاز ہوتا ہے، یہ خراج عقیدت ملاحظہ ہو مولانا رومی کہتے ہیں کہ ان دونوں یعنی افغانی و سعید حلیم پاشا سے بہتر جواں مرد مشرق کی زمین نے پیدا نہیں کیے۔

گفت "مشرق ایں دوکس بہتر نزاد ناخنِ شاں عقدہ ہائے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال زندہ از گفتار او سنگ وسفال
ترک سالار آں حلیم درد مند فکر او مثل مقام او بلند

یہ صرف ملکوں کے اتحاد پر مشتمل نہ تھا بلکہ اتحادِ فکر و عمل کا ایک آفاقی مربوط نظام تھا۔ جو اقبال کے فکری سرچشموں کی آب یاری میں معاون ثابت ہوا۔ اندازہ لگائیے کہ سید جمال کی تحریک بین اسلامی کا ذکر تشکیل جدید کے چھٹے خطبے میں بھی موجود ہے۔ چوتھے خطبہ میں افغانی کے افکار کی تحسین کی ہے۔ یہ صرف ہمسایہ یا اسلام کے افکار تک محدود نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مغربی مفکرین اور دانشوروں کے بیسیوں نام اور ان کی فکر کے حوالے اقبال کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اقبال کی تخلیق درحقیقت عصری محسوسات اور مشاہدات کا ایک حیرت کدہ ہے۔ شعری حوالوں میں تقریباً بائیس نام ہیں، جن کا ذکر اشارتاً کیا گیا ہے، اقبال کی عصری آگہی دیکھیے کہ Wumdi wilhelm (۱۸۳۲-۱۹۲۰ء) جیسے معاصر دانشور کا بھی حوالہ موجود ہے۔ خطبات تو عصری مشاہدات کا ایک روشن مرقع ہیں جس میں بیسیوں مفکرین کے نام اور ان کے نظریات پر گفتگو موجود ہے۔ قیام مغرب کے دوران جن مفکروں سے ملاقات رہی ان کے علاوہ بہت سے نام ہیں جن کا تذکرہ خطبات میں موجود ہے۔ ساتویں خطبہ میں Heisenberg.W. کا ذکر ہے۔

ان سب کے ساتھ ملک کی تحریک آزادی کے ماہ وسال کی جھلک بھی اقبال کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ترانۂ ہندی سے تصویر درد، خلافت تحریک، جلیان والا باغ، قوموں کے انتشار، بے حسی اور بے عملی کے سبب روحِ ہند کی تڑپ اور سورماؤں کے سوز و ساز کی روداد اقبال نے شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو
سفالِ ہند سے مینا وجام پیدا کر از خوابِ گراں خواب گراں خواب گراں خیز

لہو کی گردش تیز کرنے والے اشعار پیغام بن کر مسیحائی کرتے ہیں ۔ اقبال کے شعری نگارخانے میں کیا کچھ نہیں ہے۔ اقبال اپنے دور کے ہی نہیں آنے والی سبھی صدیوں کی ترجمانی کر گئے یہ ان کے فکر ونظر کی رفعت تھی جو آج تک ہمیں متحیر کرتی ہے۔ آنے والے دور کی تصویر کا مشاہدہ اقبال کے کلام ہیمیں موجود ہے۔ کہیں کہیں کلام کی یہ الہامی بشارت قاری کو حیرت زدہ کرتی ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(بال جبریل)

یا پھر اسرار کے یہ اشعار:

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است محرم از ناز اوہائے عالم است

یعنی وہ جہانِ نو جو ابھی پردۂ وجود سے نمودار ہونے کو ہے میں اس سے بھی واقف ہوں ۔ میں موجود کا نہیں مستقبل کا شاعر ہوں۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم من نوائے شاعرِ فردا ستم

سرسید نے اس خیال کو شعلہ فشانی بخشی ۔ نذیر احمد، محسن الملک، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی سب نے اسی فکر کو اپنی تحریر کا وظیفۂ حیات قرار دیا۔ ان بزرگوں کی تخلیقات میں کسی نہ کسی عنوان سے یہی اصلاح رجحان کارفرما ہے۔ اقبال اپنے زمانے کے پروردہ اور نئے زمانے کے نغمۂ نو بہار کی بشارت کے پیامبر بھی تھے۔ ان کے کلام میں ان کے دور کا بھرپور عکس و احساس موجود ہے تو دوسری طرف اقرار کرتے ہیں کہ نئی دنیا اور نئے زمانے کی تلاش ان کی ایک آرزو ہے اس جہانِ نو کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب اس موجود دنیائے دوں کو مسمار کردیا جائے ۔ بلکہ اسے نذرِ آتش کردیا جائے اور راکھ کے ڈھیر سے نئی دنیا آباد کی جائے، ملک میں ایک آواز تھی جو انگریزی اقتدار کے انتقام میں ملک میں بڑی تبدیلی کے لیے بے چین تھی ۔ خاکسار تحریک اور سبھاش چندر بوس کی انقلابی آوازوں میں یہ تپش محسوس کی جاسکتی ہے۔ مختلف قریہ وقصبات میں سلگتی لکڑیاں بھی آتش وآہن کی منتظر تھیں۔ ان کے دوش بدوش سماجی بہتری کی خاطر اصلاح وفلاح کی حکیمانہ تدبیریں بھی روبہ عمل تھیں۔ قبیلوں اور قوموں

کے لیے نسخۂ شفا نظر آ رہا تھا۔ رفاہ وفلاح نے فاصلوں میں اضافہ اور عداوتوں کو ہوا بھی دی۔ ملتوں کے درمیان اشتراکِ عمل کی سب سے مؤثر آواز اقبال کی تھی۔ ۱۹۰۴ء کا یہ پیغام:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

وہ آنے والے زمانوں کے محرمِ راز بھی ہیں انہیں اس فرسودہ دنیا سے کوئی غرض نہیں۔

جہاں وہ چاہیے کہ ہوا بھی نوخیز

یہ مصرعے بھی ملاحظہ فرمائیں:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

یہ سب انگریزی حکومت کے کہنہ نظام کے خلاف باغیانہ خیالات کی پرورش تھی۔ ہندوستان کو اس کی ضرورت تھی۔ آزاد وحالی اور شبلی کی تخلیق کا جوہر خاص ان کا اصلاحی رویہ ہے۔ جو صرف شعر و ادب تک محدود نہ تھا بلکہ پوری بساطِ زندگی میں انقلابی اصلاح کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مدوجزر اسلام، شہر آشوب اسلام، حب وطن، مناجاتِ بیوہ کے نقوشِ روشن پر اقبال کے دین وسیاست، ہلالِ عید، نالۂ یتیم، اسلامیہ کالج کا خطاب، تصویر درد، شمع وشاعر، شکوہ وجوابِ شکوہ، طلوع اسلام وغیرہ میں حالی و شبلی وآزاد اور سرسید ونذیر احمد کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

تنقید وتخلیق میں بھی اصلاح وانحراف کے منشور مرتب کیے گئے۔ ادب کو زندگی کی سرگرمیوں نیز معاشرے کے بست وکشاد کا ترجمان بنایا گیا اقبال کی ادبی فکر یا فنی تصورات کی اساس انہیں خیالات پر قائم کی گئی۔ شاعری کو جزوِ پیغمبری کہہ کر اقبال نے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی پختگی بخشی۔ معجزۂ فن کو خونِ جگر کی نمود کہہ کر مہر ثبت کردی۔ مگر یاد رہے کہ یہ خونِ جگر نرم ونازک یا لطف وانبساط کا صرف سامان نہیں۔ اسے حرب وضرب سے دوام اور آبِ بقا حاصل ہوتا ہے۔ بنیادی نکتہ بھی پیش نظر رہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

اقبال کا اعلانِ عام بھی پیش نگاہ رہنا چاہیے:

از جمالِ بے جلال الاماں

اقبال نے اپنے شعر وفن کے بارے میں اکثر اظہار خیال کیا ہے۔ اصرار ہے کہ انہیں شاعر

نہ کہا جائے کیونکہ وہ نوائے پریشاں کے اظہار کے لیے مجبور ہیں۔اور وہ رازِ درونِ حیات وکائنات کے محرم مامور کیے گئے ہیں۔"اسرارِ خودی" کے تمہیدی اشعار میں انکار کا برملا اقرار ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں ہیں بلکہ اپنے مخصوص فلسفہ وفکر کے اظہار کے لیے شعری وسیلے کو بروئے کار لا سکے ہیں۔ان ہی اشعار میں یہ بھی اعتراف ہے کہ وہ ذرہ کی طرح ہیں مگر ان کے گریبان میں ہزاروں مہر وماہ روشن ہیں۔وہ اپنے دور ہی کے نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے بھی ترجمان ہیں۔اور وجود میں آنے والی کائنات کے اسرار سے واقف ہیں یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے سنجیدگی سے شاعری یا فن پر توجہ نہیں دی اور پیغام کو ترجیح دیتے رہے۔گویا فکر وفلسفہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔شعر وفن ثانوی ہے۔وہ معترف ہیں کہ انہیں زبان سے واقفیت نہیں ہے۔اور نہ ہی اظہار کے کسی مخصوص لب ولہجے کے ترجمان ہیں انہیں ایک دلکشا صدا چاہیے خواہ وہ عجمی ہو یا کہ تازی۔شعری ذریعۂ اظہار کے وسیلے سے فکر ونظر کو دلوں میں اتارنے کی حکیمانہ حکمتِ عملی اقبال کے پیش نظر تھی۔اقبال ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء یعنی پانچ برس تک غور وفکر میں منہمک رہے۔فرد کی بے حسی وبے مائیگی اور معاشرہ کا انتشار تمام تر خرابیوں کا سبب سمجھ میں آیا۔اقبال کی توجہ فرد کی عظمت اور معاشرہ کی اجتماعی قوت پر مرکوز ہوگئی۔محکومی وغلامی سے نجات کے لیے اجتماعی قوت ہی نسخۂ شفا نظر آیا۔ملک کی مختلف اور متضاد تہذیبوں کے فکر وعمل کا رشتۂ اشتراک ٹوٹ رہا تھا،ایسی فضا میں ملک کے مقدر اور مستقبل کی فکر اہل نظر کو مضطرب کر رہی تھی۔مل کر تدبیریں تلاش کرنے کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔اگرچہ نفرتوں کی زہرناکی بھی مفاد پرستوں کے زیر سایہ برگ وبار لا رہی تھی۔اکثریت کا بے جا غرور ہر چھوٹی تہذیبی اکائی کو ہراساں کر رہا تھا۔عدم تحفظ کا احساس بڑھ چلا تھا۔مذہبی جنون کی حامل جماعتیں ملک کی پوری فضا کو مسموم کر دینے پر تلی تھیں۔انہیں سرکار کی تائید بھی حاصل تھی۔اس بادِ مخالف کا ایک مرکز لاہور تھا۔گو پورا ملک زد میں تھا مگر قوموں کی آویزش کا ایک مرکز یہ شہر تھا جو فسطائیت کے فروغ کے لیے بھی معروف ہے۔

یورپ کے تین سال کے قیام نے مشرق ومغرب کی طرزِ زندگی اور تہذیب کے مشاہدے نے اقبال کو ایک نئی نظر بخشی تھی۔زوالِ مغرب ان کے روبرو تھا اور مشرق کے منتشر معاشرہ سے وہ پوری طرح واقف تھے۔قدروں کی پامالی سے وہ مضطرب تھے۔مشرق یعنی ہندوستان سے ان کی محبت جنونِ عشق تک پہنچ چکی تھی۔اس جذبۂ شوق سے سرشار ہو کر اقبال ملک کے باشندوں کی خوابیدہ روح

کو بیدار کرنا چاہتے ہیں کہ مال وزر سے شوکت وعظمت نہیں حاصل ہوتی تیرے وجود میں ایک آتش کدہ روشن ہے اسے شرر بار بنادے۔ بے کراں جدوجہد کے لیے بیتاب ہوجاتا کہ زمین وآسماں تیرے لیے سرنگوں ہوجائیں۔ فرار وگریز کا دور ختم ہوچکا ہے اپنے خونِ گرم سے نئی دنیا آباد کر اس کامرانی کے لیے اپنی ذات کوقوم کے اجتماعی وجود میں ضم کردے کیوں کہ جب فرد معاشرے سے پیوستہ ہوتا ہے تو لازوال قوت اور کامرانی قدم چومتی ہے۔

نفرت ومحبت انسانی نفسیات کا ناگزیر حصہ ہے۔ دونوں کے مابین راہِ اعتدال میں ہی عافیت ہے۔ عہدِ قدیم کی معرکہ آرائیوں سے انسانی تاریخ شرمسار ہے۔ تہذیبی ارتقاء کی عظمتوں کو حاصل کرنے والا دورِ جدید بھی نفرتوں کے نرغے میں جاں بلب ہے۔ بنی نوع انسان کو عالم گیر اخوت کا پیغام دینے والے ادارے اور نظریے پامال ہورہے ہیں۔ چند برسوں پہلے ''تہذیبی تصادم'' کے نام سے شائع ہونے والی کتاب نے مشرق ومغرب کے مناقشات کو آگ اور ہوا کی خوراک فراہم کی ہے۔ کسے خبر تھی کہ ایشیا میں خاک وخون کا تماشا دیکھنے والے خود اپنی کمین گاہوں کو شعلہ وشرر کی زد میں دیکھیں گے۔ جسے بحرالکاہل کا پانی بھی نہ بجھاسکے گا۔ اب یورپ بھی عداوتوں کے ہیجان میں مبتلا ہے۔ مشرقی ممالک سے تعاون کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ یہ منظر بہت عجیب ہے۔ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ

غیروں کی شہ اور کچھ ہماری بدبختی نے امن وآشتی کی سرزمین کے خس وخاشاک میں چنگاری رکھ دی ہے کہ ملک کے سکون وسلامتی کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔ چند افراد یا گروہ کے منصوبہ بند ارادوں کو روبہ کار لایا جارہا ہے تاکہ سماج کا پیراہن تارتار ہوجائے اور معاشرہ تنکے کی طرح بکھر جائے، اس کے برخلاف ہمارے سماجی اور فکری رشتوں کو استحکام بخشنے والے عناصر بھی نظم وضبط کی بحالی کے لیے برسرپیکار ہیں۔ دین ودانش سے مضبوط اور مثبت اقدار کے فروغ میں بہت سے خرد وبزرگ جان وتن کے ساتھ مصروف ہیں۔ عارضی انتشار سے مقابلہ آرائی بھی سخت اور جاں طلب ہے۔ پھر بھی جیالوں کو آفریں ہو کہ سماجی رشتوں کو سنبھال کر رکھنے میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ ہر طرف سے اختلاف کا آتش کدہ روشن کیا جارہا ہے۔ عقائد وافکار کے ساتھ زبان وقلم اور بود وباش سبھی نفرتوں کی زد میں ہیں۔ پوری دنیا

میں سرزمین ہند کی سب سے بڑی خوبی اختلاف واختلاط ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں بہت نمایاں ہے۔ اختلاف کی ایسی مکروہ صورتیں اکثر ہماری رسوائی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ اگر قوموں کی کدورتیں دل کے درمیان نہ ہوں تو یہ ہمارا امتیاز اور افتخار بھی ہے کہ گل ہائے رنگ رنگ کے اختلاط کو ہم نے زینتِ چمن کا سبب تسلیم کیا ہے۔ اس میں پوری معاشرت کی فوز وفلاح ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ اخوت ومحبت کے جام چھلکاؤ۔

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ جامِ صہبائے محبت باز دہ

پورے سماج اور ملک کے ہر گوشے کے لیے یہی نسخۂ شفا ہے۔ ایک ہی رسی میں ان تمام بکھرے دانوں کو پرونے سے ہی ہماری سالمیت برقرار رہ سکتی ہے۔ اختلاف کی بنیاد پر جنم لینے والی عداوتیں انسانیت کے اعلیٰ تصور کے منافی ہوتی ہیں۔ اور انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کو پارہ پارہ کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ ہمیں باور کرایا گیا ہے کہ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ پھر اختلاف ہنگاموں کا محل کیوں ہوسکتا ہے۔ اختلاطِ حسن عالم گیر کا مظہر ہے۔ انسانی شرف کا یہ مقدس تصور بنی نوع انسان کی فکر اور کردار کا حاصل ہے۔ اور خام فکر ان کو تاراج کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ معاشرہ اور افراد کو انتخاب کرنا ہے کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی بہت ہی خوبصورت اور مثالی نظم 'نیا شوالہ' میں انسانی فلاح کے لیے خیر کثیر کے ایک نایاب نسخے پر اصرار کیا ہے۔ جسے ہر ہندوستانی کے رگِ خون میں رواں ہونے کی آرزو کی گئی ہے۔ ملک کے جنوں پرست جماعتوں کو اپنے مفاد اور وجود کے لیے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا وہ جوئے کم آب کی طرح گھٹ کر جینا چاہتی ہیں یا کشادگی کا دامن پھیلا کر جینے سے لطف اندوز ہونا چاہیں گی۔ وقت کی ساز گاری آنکھ کی جھپک سے بھی کم ہوتی ہے۔ دستِ قضا کے ہاتھوں بے شمار قومیں ایک آن میں تہ خاک ہوئی ہیں۔ اس ملک اور یہاں کے باشندوں کو سلیقے سے جینے کے لیے فکر ونظر کی کشادگی کا عہد لینا ہوگا۔ چھوٹی سی چھوٹی اکائی بھی اپنے وجود اور نمود کے لیے مضطرب ہوتی ہے۔ ہر اکائی کو اس اضطراب کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ اکائی کے اتحاد سے وحدت کا مرکز مستحکم ہوسکے۔ باہمی حسنِ سلوک اور ایثار ومحبت سے ہر قطعۂ زمین کو رشک جناں بنانے کے لیے یہی کارگر عمل ہے۔ اور روزِ الست کا پیمان وفا بھی۔ دیگر اقوام وقبائل سے قطع نظر ملتِ براہیمی کو کارگہی کے میدان میں سب سے پہلے اترنا ہوگا۔ کیوں کہ قوم کی اس خاص

ترکیب کی تفکیری قوت کا سرچشمہ توحید کے ساتھ رسولِ ہاشمیؐ کی حکمتِ بالغہ ہے جو وحدتِ مسلم کے ساتھ وحدتِ آدم کے آئینِ مسلم سے مستحکم ہے۔انسانوں کے اجتماعی تصور کا مربوط نظام خیرالبشرؐ کے آئین واعلان میں ہی دستیاب ہے۔اقبال کے فکری نظام کا یہی نقطۂ معراج ہے۔جس سے ان کے افکار کی دنیا روشن ہے۔اقبال کا یہ اعتراف پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ان کے افکار کی دنیا کا نوروسرور آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی کے فیضان سے معمور ہے۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

(پس چہ باید کرد)

گویا رحمتِ عالمؐ کی آغوشِ مبارک میں اقبال کے فکر وفلسفہ کی پرورش ہوتی ہے۔ان کے فکر ونظر کا مصدر و ماخذ وہی ذات گرامیؐ ہے۔اقبال کا مصرع ہے کہ عالم آب وخاک میں اسی کے ظہور سے فروغ نظر کو جلا ملتی ہے ذرۂ ریگ کو طلوعِ آفتاب کی تابانی اسی ذات مبارکؐ سے حاصل ہوئی ہے۔ دین ودانش کا مقصود ومنتہا بھی وہی ہے۔

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

نوعِ بشر کی اجتماعیت کا اعلانیہ اور عمل آئینِ دینِ مصطفیؐ کا جلی عنوان ہے۔اقبال نے اسی سبب رحمتِ عالمؐ کو اپنی فکری دنیا کا مرکزِ نور بنایا ہے۔

کیا تونے صحرا نشینوں کو یکتا نظر میں خبر میں اذانِ سحر میں

اقبال کو حددرجہ قلق اور تشویش ہے کہ ملتِ اسلامی کے انتشار کی اندوہ ناکی کب ختم ہوگی۔ سیاسی رہنماؤں کے اختلاف سے قطع نظر داعیانِ دین کی کم نگہی سے وہ بہت ملولِ خاطر تھے۔صوفی و ملا کی بے بصیری اور نارسائی نے حرم کو رسوا کردیا ہے۔اس دور کی تاریخ میں حفاظتِ دین کے علم برداروں کے مفادات اور ان کی فکر ونظر کی محرومی نے سادہ لوح بندوں کو دامِ فریب میں اسیر کیا ہے۔اقبال کی نظر ایک نئے اجتہاد پر تھی مگر کم نظر عالمانِ دین سے باخبر رہنے کی تاکید بھی ان کی فکر کا ایک اہم پہلو ہے۔

ز اجتہاد عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

اقبال کی آرزو ہے کہ سبھی رسولِ ہاشمیؐ کی ترکیب خاص میں مدغم ہوجائیں۔اور دل ونظر کے سفینے کو اختلاف کے آشوب سے بچالیں۔مذہبی طبقے سے بعض خام فکر کے خودساختہ افراد کی سیاسی فکر

سے امت مسلمہ کو تشویش لاحق تھی۔ اقبال نے ان سے آگاہ کیا ہے اور ملامت بھی کی ہے۔

الاماں از روحِ جعفر الاماں الاماں از جعفران ایں زماں

کے اشارہ میں بڑا رمز ہے۔

حضور رسالت مآبؐ بنی نوع انسان کی تاریخ میں سب سے عظیم اور ہمہ گیر دائمی انقلاب کے داعی ہیں۔ آپؐ کی بعثت کا تمام تر مقصد ہر شعبۂ زندگی کے لیے انقلاب آفریں پیغام کو روبہ عمل لانے کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ نبوت سے قبل آپؐ کے کردار وعمل کی شناخت بھی ایک انقلابی امتیاز پر موقوف تھی۔ شب وروز کے ہر لمحے کا احتساب اور غاروں کی خلوت نشینی میں تزکیہ اور تہذیب نفس پر محویت ایک بڑے نظام اور دستور کی تعمیر کا اشارہ دیتی ہے۔ اس تشکیل میں کئی برس گزرے بلکہ حیات کا ایک بڑا حصہ رازِ درونِ حیات کے عرفان میں گزرا۔ جسے بعثت سے قبل کی آگہی کا باب العرفان کہا جاسکتا ہے۔ اس سعی وسعادت نے وادیٔ فاراں کے اعلانیہ کو ہر فرد کے لیے قابلِ احترام بنادیا۔ یہی اعلانیہ حیاتِ انسانی کا منشور بن گیا۔ ذکر وفکر کے ساتھ عمل واحتساب فکر دینی کا ناگزیر حصہ قرار پایا۔ باطن کے انقلاب نے خارجی وجود کو زیروزبر کردینے کا پیغام دیا:

ذکر و فکر علم و عرفانم توئی قطرہ و دریا و طوفانم توئی

اسرار خودی میں اقبال نے ”اے امینِ حکمتِ ام الکتاب“ کہہ کر اس نکتے کی وضاحت کی ہے۔ تین سال بعد خودی سے گزر کر بیخودی کی باری آتی ہے۔ آتشِ عشق بصیرت کی بیش بہا تجلی سے شعلۂ انگیز ہوجاتی ہے۔ رکن توحید کے بعد دوسرا رکن رسالتؐ ہے۔ حبِ رسالت مآبؐ کی سرشاری تفکیر وفلسفہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ آپؐ کی ذات وصفات میں دانش وبینائی کا عنصر غالب اظہار بن کر سامنے آتا ہے۔

از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دینِ ما آئین ما

یہ عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیفتگی کے ساتھ فلسفیانہ نکتہ آفرینوں کا منشور مرتب کرنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ انتہائی فکر انگیز اور منطقی مباحث کے یہ اشارے ملاحظہ ہوں:

پس خدا برما شریعت ختم کرد بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفل ایام را او رسل را ختم وما اقوام را

بنی نوع بشر کے لیے تکوینی اور تشریعی نظام کا یہ آخری پیغام ہے۔

نوعِ انساں را پیام آخریں حاملِ او رحمت للعالمین

ذکر رسالتؐ کے تذکرے کا سبب اقبال کے فکری رویہ کے سب سے اہم نکتہ کی وضاحت ہے۔ مشرقی شعری ادبیات میں یہ ذکر اور نبوت سے فکری نسبت ناپید ہے۔ یہ اقبال کا امتیاز ہے اور بنائے فکر و تحقیق بھی۔ عہدِ اقبال کا یہ فکری رجحان پوری صدی پر محیط ہے۔ یہ ماہ و سال سیرت نگاروں کی کہکشاں سے معمور ہے بیسویں صدی کے نصف اول میں سیرت رسولؐ پر علمی ذخیرے کا جو بیش بہا سرمایہ تخلیق ہوا وہ قابل فخر اور ناز آفرین ہے۔ ان اربابِ نظر کے لاشعوری جذبۂ شوق پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عہد اقبال میں سیرت نگاری پر اکابر علم کی خاص توجہ ہمیں غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس ذات گرامی کے ذکر و فکر کو جہانِ نو کی تعمیر کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ ایشیائی بیداری میں یہ ایک تاب کارتوئی کا موجب بنا۔ آج کے اضطراب کو بھی اس سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نوع انساں کی مثالی مدنیت کا انحصار قومِ رسولِ ہاشمی کی ترکیبِ خاص میں ہی ہے۔ جسے اقبال نے نوع انساں کے لیے پیام آخریں بتایا اور یہ پیغام ہر ذرہ اور زمین کی روئیدگی میں موجود ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیؐ اورا بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ است

خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اہل حکومت میں روابط
''انفاس العارفین'' کے حوالہ سے

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

علما و مشائخ اور اہل حکومت میں روابط کا مطالعہ ایک اہم و دلچسپ موضوع ہے جو مختلف دور کے حوالے سے زیر بحث آتا رہا ہے۔ عہد اسلامی کے ہندوستان سیاق کے میں بھی یہ مسئلہ قدیم وجدید مؤرخین کے مابین موضوع بحث رہا ہے۔ جدید دور میں اس موضوع پر پروفیسر خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور سید صباح الدین عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہم کے مطالعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں،(۱) ان علما کے اہل حکومت سے تعلقات و روابط کا مطالعہ اور زیادہ دلچسپی کا باعث رہا ہے جو تصوف سے تعلق رکھتے تھے اور کسی خاص سلسلہ سے منسلک تھے۔ اس لیے کہ بادشاہ یا اہل حکومت سے تعلقات کے مسئلہ پر مشہور سلسلوں کے صوفیہ کا مختلف موقف رہا ہے۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ چشتی سلسلہ کے صوفیہ اس کے خلاف تھے۔ وہ بادشاہوں یا اہل حکومت سے ملنا جلنا اور شاہی مناصب، مراعات و عطیات قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اسے روحانی زندگی کی ترقی کے منافی تصور کرتے تھے۔ دوسری جانب سہروردی و نقشبندی سلسلہ کے صوفیہ اس میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے۔ وہ اہل حکومت کی اصلاح کی خاطر یا نظم و نسق میں سدھار لانے کے لیے ان سے تعلقات و روابط کو ضروری تصور کرتے تھے اور اس کے لیے مختلف ذرائع استعمال کرتے تھے،(۲) شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے آبا و اجداد بنیادی طور پر نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں چشتی سلسلہ کے اصول و تعلیمات کے اثرات بھی پائے جاتے تھے جیسا کہ بعض جدید اسکالرس کی رائے ہے اور زیر مطالعہ ''انفاس العارفین'' میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔(۳)

☆ سابق استاد، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

شاہ ولی اللہ کی مشہور فارسی تصنیف ''انفاس العارفین'' اصلاً تذکرہ کی کتاب ہے۔(۴) اس میں مولف گرامی نے اپنے والد، تایا، اجداد و ننہالی اعزّہ کے حالات، افکار و اوصاف بیان کیے ہیں۔ حرمین شریفین کے اپنے اساتذہ کے تذکرہ کے علاوہ آخر میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس کی وجہ سے اس کتاب میں خودنوشت سوانح عمری کا رنگ بھی آ گیا ہے۔ کتاب جو سات حصوں پر مشتمل ہے، زیر بحث موضوع پر بہت سی مفید معلومات فراہم کرتی ہے، گرچہ یہ معلومات مختلف ابواب کے تحت بکھری ہوئی صورت میں ہیں لیکن ان کی ترتیب و تجزیہ سے خانوادۂ شاہ ولی اللہ اور اہل حکومت میں روابط سے متعلق بڑے اہم تاریخی حقائق سامنے آتے ہیں، جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

''انفاس العارفین'' میں شاہ ولی اللہ کے اہل خاندان کے بارے میں جو بنیادی معلومات دستیاب ہیں وہ یہ ہیں: ان کے اجداد میں پہلے شخص ہیں جو ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے وہ مفتی شمس الدین تھے۔ ان کی اولین جائے اقامت قصبہ روہتک (ہریانہ) تھی، یہ دہلی و ہانسی کے درمیان ہے اور دہلی سے تقریباً ۷۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔(۵) مفتی شمس الدین قریش خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ صاحب علم و فضل اور ذی وقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی وجہ سے اسلامی شعائر کو کافی ترویج ملی (۶) ''انفاس العارفین'' سے صاف طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ مفتی شمس الدین کس سنہ یا زمانہ میں ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے لیکن بعض جدید مؤرخین نے مفتی شمس الدین اور شاہ ولی اللہ کے مابین جو لوگ اس خاندان میں گذرے ہیں، ان کی طبعی عمر کا اندازہ کر کے یا بعض دوسرے قرائن کی بنیاد پر ان کی سکونت کا زمانہ چھٹی، ساتویں، آٹھویں صدی ہجری (بارھویں، تیرھویں، چودھویں صدی عیسوی) بتایا ہے۔(۷) البتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوانح پر ایک انگریزی کتاب کے مصنف اے، ڈی مضطر نے اسے واضح طور پر سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانۂ حکومت (۱۲۶۵-۱۲۸۶ء) سے منسوب کیا ہے۔(۸)

سلاطین دہلی میں سب سے پہلے سلطان سکندر لودی (۱۴۸۹-۱۵۱۷ء) سے خانوادہ شاہ ولی اللہ کے گہرے روابط کا ذکر ملتا ہے، بلکہ یہی ربط اس خانوادہ کے روہتک سے پھلت (مظفرنگر) منتقل ہونے کا سبب بنا جسے بعد میں شاہ صاحب کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ''انفاس العارفین''

سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ دونوں کے ننہالی اعزہ مشرقی یوپی سے تعلق رکھتے تھے اور سلطان سکندر لودی سے دونوں گھرانوں کے روابط قائم ہوئے۔ شاہ عبدالرحیم کے نانا شیخ رفیع الدین محمد کے پردادا شیخ حسن سلطان سکندر کے عہد میں جونپور میں تعلیم وارشاد کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ سلطان ان کے علم وفضل اور بزرگی سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں دہلی منتقل ہونے کی دعوت دی۔ اسے قبول کرتے ہوئے انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب نے سلطان سکندر لودی کی تعریف اس انداز میں کی ہے کہ وہ دہلی کے انتہائی انصاف پسند سلاطین (اعدل سلاطینِ دہلی) میں سے تھے۔(۹) سلطان کے شیخ حسن سے گہرے ربط کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک بار شہزادہ فتح خاں کے دل میں اپنے والد یعنی سلطان سکندر کے خلاف بغاوت کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اس باب میں امراء سلاطین کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ شہزادہ شیخ حسن کے معتقدین میں سے تھے۔ جب ان سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو انھوں نے اس سے باز رہنے کی ہدایت دی اور اسی پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے بغاوت کا ارادہ ترک کردیا۔ اس وجہ سے ان سے سلطان کی عقیدت اور زیادہ بڑھ گئی۔(۱۰) یہاں یہ واضح رہے کہ صاحب "اخبار الاخیار" شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے شہزادہ کے بجائے سلطان کے بھائی کے آمادۂ بغاوت ہونے کے حوالہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔(۱۱)

دوسری جانب یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کے ننہالی اجداد اصلاً بارہ بنکی کے ایک مقام سدھور کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاص مشغلہ درس وتدریس اور تعلیم کا فروغ تھا۔ انہی میں شیخ احمد بن یوسف کی رسائی سلطان سکندر کے دربار میں ہوئی اور وہاں انھوں نے اپنی صلاحیت ولیاقت اور حسنِ کارکردگی سے ایک خاص مقام پیدا کرلیا جو سلطان سے قربت کا ذریعہ بن گیا۔ سلطان نے انھیں سادات بارہہ کے قریب پھلت میں چند مواضع بطور مددِ معاش عطا کیے اور پھر ان کا خاندان پھلت منتقل ہوگیا۔(۱۲) بعد میں اسی خاندان کے شیخ محمد پھلتی (م ۱۷۱۳ء) کی صاحبزادی (فخر النسا) سے شاہ عبدالرحیم کا نکاح ہوا اور پھلت میں ان کے قیام کا سلسلہ استوار رہا۔ اس ضمن میں پھلت کی آراضی مددِ معاش کی نسبت سے اس واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاہ عبدالرحیم کے زمانہ میں بعض مخالفین نے مقامی رؤسا یا زمینداروں کو اس بات پر اکسایا کہ شاہ عبدالرحیمؒ کے اہل خاندان کے قبضہ

میں شاہی فرمان کی مقررہ آراضی سے زیادہ ہے۔ ان رؤسا نے آراضی کی پیمائش کرانی چاہی اور اس کے لیے ماہرین کو طلب کیا۔ شاہ عبدالرحیم کے خاندان والوں نے ان سے کہا کہ پیمائش کرنے والے مخالفین کے ہم نوا ہیں تو پھر کیسے مسئلہ حل ہوگا۔ شاہ صاحب نے خاندان والوں کو تسلی دی اور پیمائش کے وقت وہ موقع پر حاضر ہوئے (ایشاں تسلّی دادم درروز پیمود بایشاں حاضر شدم)، چنانچہ وہ موقع پر حاضر ہوئے اور اللہ رب العزت کی جانب متوجہ ہو کر دعا میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار ان کے خاندان والوں کے حق میں نتیجہ نکلا۔(۱۳)

جہاں تک حکومت کے نظم و نسق سے اس خاندان کی وابستگی کا معاملہ ہے، یہ اس ملک میں ان کے جد امجد مفتی شمس الدین کے سکونت اختیار کرنے کے ساتھ ہی شروع ہوا اور بعد میں ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ اس خاندان میں قضا، افتا و احتساب کا منصب کئی سو سال تک قایم رہا۔ خود شاہ ولی اللہ نے مفتی شمس الدین کی اولاد و احفاد میں نام بنام ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو ان ذمہ داریوں سے وابستہ رہے۔ دوسرے انھوں نے اس وقت کی یہ معروف روایت بھی بیان کی:

"از بعض قرائن چناں مفہوم شود کہ دراں زماں ہر محتشمے از مسلماناں کہ در مثل ایں بلدہ اقامت کردے سیاست بلد از جہت قضا و احتساب و افتا بوی مفوّض می بودے بے آں کہ بنام قاضی و محتسب اورا می خوانند واللہ اعلم"۔(۱۴)

(جب بھی کوئی صاحبِ علم یا معزز مسلمان کسی قصبہ میں سکونت اختیار کرتا تو اسے قضا، افتا اور احتساب کی ذمہ داریاں سپرد کر دی جاتیں اور یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ ان کے لیے باقاعدہ قاضی، مفتی یا محتسب کا لقب استعمال کیا جائے۔)

خاص بات یہ ہے کہ ان کے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اجداد نے روایتی و غیر روایتی دونوں طور پر یہ خدمات انجام دیں۔ انفاس العارفین میں انھوں نے اپنا جو شجرۂ نسب رقم فرمایا ہے اس میں متعدد لوگوں کے نام سے قبل "قاضی" یا "مفتی" کا لاحقہ استعمال کیا ہے۔(۱۵)

"انفاس العارفین" سے یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے متعدد افراد مغل دور میں فوجی ملازمت سے منسلک رہے۔ یہ سلسلہ ان کے جد خامس شیخ محمود بن قاضی قوام سے شروع ہوا تھا۔ بعد میں شیخ احمد، شیخ منصور و شیخ معظم بھی فوجی خدمت سے وابستہ رہے۔(۱۶) خود شاہ صاحب

کے دادا شیخ وجیہ الدین فوجی مہارت اور جنگ میں شجاعت کے مظاہرہ کے لیے بہت معروف تھے۔ شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد کی روایت سے ان کی بہادری کے متعدد واقعات ''انفاس العارفین'' میں بیان فرمائے ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب اورنگ زیب اپنے باغی بھائی شاہ شجاع کے ساتھ بنگال کے علاقہ میں جنگ میں مصروف تھے تو شیخ وجیہ الدین نے اس دوران مخالف فوج سے لڑتے ہوئے زبردست شجاعت کا مظاہرہ کیا جس کا مشاہدہ خود بادشاہ نے بھی کیا تھا۔انھوں نے مخالف لشکر کے ایک مست ہاتھی کو تنِ تنہا زیر کر دیا تھا جو اس کی پسپائی کا سبب بنا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ان کے منصب میں اضافہ کرنا چاہا لیکن انھوں نے بوجہ استغنا و قناعت اسے قبول نہیں کیا۔(۱۷) اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالوہ کے قصبہ ہانڈیا کے علاقہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے دفاع میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔(۱۸) اسی ضمن میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فوجی خدمت انجام دیتے ہوئے بھی شیخ وجیہ الدین تقویٰ و پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتے تھے اور غیر شرعی امور سے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے۔شاہ ولی اللہ اپنے والد گرامی کی سند سے یہ بیان فرماتے ہیں کہ فوجی مہم کے دوران جب لشکر کسی کھیت سے گزرتا تو شیخ وجیہ اپنا گھوڑا کھیت میں نہیں ڈالتے بلکہ دوسرا راستہ اختیار کر لیتے۔اسی طرح لشکر میں کبھی کبھار کھانے پینے کے سامان کی کمی ہو جانے پر وہ فاقہ کر لیتے لیکن کسی کا جانور ناجائز طور پر استعمال نہیں کرتے تھے جبکہ بہت سے فوجی بلا تکلف یہ حرکت کر لیتے تھے۔(۱۹) مزید برآں یہ روایت بھی منقول ہے:

> ''چوں دو سہ فاقہ کشیدند و قوت بر سقوط مشرف شد رزّاقیت رزّاقِ حقیقی جل شانہ دریں صورت ظہور فرمود کہ بحسب اتّفاق چناں کہ در وقت فکری باشد زمین مرا بچا بک کافتند ازاں نخود بقدر قوت ایشاں پیدا شد......آنرا شستند و پاکیزہ کردند و مبلول ساختند و تناول نمودند''۔(۲۰)

> (ایک دفعہ فاقہ کرتے کرتے کئی دن گزر گئے، آخر کار رزاقِ حقیقی کی صفت رزاقیت کا ظہور ہوا اور وہ اس صورت میں کہ سوچتے سوچتے چابک سے زمین کریدنے لگے تو وہاں سے انہیں کھانے بھر چنے ملے،انہیں پاک و صاف کیا اور اُبال کر کھا لیا۔)

جہاں تک سلاطین و ملوک سے علماء و مشائخ کے براہ راست تعلقات و معاملات یا ان کے

دربار میں حاضری کا تعلق ہے، ''انفاس العارفین'' میں منقول متعدد روایات سے اس کی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ خود شاہ ولی اللہ کے والد گرامی اس کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ شیخ آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۴ھ/ ۱۶۴۲ء) نقشبندی سلسلہ کے مشہور صوفی تھے اور شاہ عبدالرحیم کے مرشد سید عبداللہ اکبر آبادی ان کے ممتاز خلفا میں سے تھے۔(۲۱) ان کے بارے میں ''انفاس العارفین'' میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ان کی شہرت شاہجہاں کے دربار تک پہنچی تو اپنے خاص معتمد و وزیر سعد اللہ خاں اور مولانا عبدالحکیم سیال کوٹی کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ شیخ کے حجرہ میں حاضری پر جب انھوں نے ان لوگوں کی تعظیم بجالانے سے احتراز کیا تو سعد اللہ خاں وزیر کو ناگوار معلوم ہوا اور کہا: ''من از اہلِ دنیا ام مستحق نیستم، امّا مولانا عبدالحکیم عالم اند تعظیمِ ایشاں لازم بود۔ فرمودند در خبر آمدہ: ''العلماء امناء الدین مالم یخالطوا الملوك فاذا خالطوھم فھم اللصوص''(۲۲) (میں تو دنیادار ہوں لیکن مولانا عبدالحکیم تو بہت بڑے عالم دین ہیں، ان کی تعظیم تو ضروری تھی، شیخ نے فرمایا کہ روایت میں مذکور ہے کہ علما دین کے امین و محافظ ہیں جب تک بادشاہوں سے دور رہیں، جب بادشاہوں سے خلط ملط رکھنے لگیں تو وہ چور ہیں)۔(۲۳)

اپنے تایا شیخ ابوالرضا کے بارے میں ان کے معتقدین کے حوالہ سے شاہ صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ بادشاہ اورنگ زیب نے ان سے ملاقات کے لیے کئی بار خواہش ظاہر کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے، دوسرے یہ کہ وہ اربابِ حکومت اور سرمایہ داروں کو ہیچ سمجھتے تھے، ان کی پیشکش اور ان کی ذات کی طرف کبھی توجہ نہ کرتے اور اگر کوئی امیر حد سے زیادہ اصرار کرتا تو اس کا نذرانہ قبول کر لیتے تھے۔ البتہ اگر کوئی غریب مخلص معمولی رقم بھی نذرانہ میں پیش کرتا تو وہ اسے کشادہ دلی سے شرف قبولیت دیتے۔(۲۴)

اسی طرح اپنے والد گرامی کے بارے میں شاہ ولی اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ ان کے ایک معتقد اورنگ زیب کے دربار سے منسلک تھے اور بادشاہ کے خاص خدام میں سے تھے۔ ان کی زبانی جب انھوں نے شاہ عبدالرحیم کی بزرگی و تقویٰ شعاری کے بارے میں سنا تو بادشاہ کے دل میں ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ انہیں میرے پاس لاؤ۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بادشاہوں اور دولت مندوں کے یہاں جانا پسند نہیں کرتے۔ بہرحال بادشاہ کو ان کی زیارت کا شدید

شوق تھا۔انھوں نے حضرت کے ایک دوسرے قریبی معتقد کے ذریعہ شوقِ زیارت کا اظہار کیا لیکن شاہ عبدالرحیم نے پھر بھی عدم رضا مندی ظاہر کی۔لیکن بادشاہ کے قاصد اس پر مصر رہے کہ بادشاہ کے نام رقعہ لکھ دیجیے تاکہ انھیں میری کوشش کے بارے میں معلوم ہو جائے۔انھوں نے ایک پھٹا پرانا کاغذ اٹھایا اور اس پر یہ تحریر فرمایا:

''بئس الفقیر علیٰ باب الامیر وحق سبحانہ تعالیٰ می فرمایں" وما حیوٰۃ الدنیا اِلّا قلیل''،اقلّ بشما رسید۔

درملفوظات بزرگان چشتیہ مذکوراست کہ ہر کہ نامِ او در دیوانِ دیوان بادشاہ نوشتہ شد اوراز دیوانِ حق سبحانہ تعالیٰ بری آرند''۔(۲۵)

(وہ فقیر/صوفی بدترین ہے جو کسی امیر کے دروازے پر حاضری دے۔قرآن کے مطابق دنیا کا مال ومتاع بہت قلیل ہے اور اس میں بھی قلیل کا قلیل آپ کو ملا ہے۔اگر آپ مجھے کچھ دینا چاہیں گے تو وہ بہت معمولی چیز ہوگی۔میں اس کے لیے اپنا نام خدا کے دفتر سے کیوں کٹوا دوں۔اس لیے کہ مشایخ چشت کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ جو شخص بادشاہ کے دربار میں اپنا نام لکھ لیتا ہے اللہ کے دفتر سے اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے)۔(۲۶)

''انفاس العارفین''ہی کی روایت کے مطابق بادشاہ نے اس رقعہ کو اپنے جیب میں محفوظ رکھا اور وہ جب نیا لباس تبدیل کرتے تو پھر اس کو جیب میں رکھ لیتے۔یہاں تک کہ سات دفعہ لباس تبدیل کرنے تک یہ خط محفوظ رہا،مزید یہ کہ فرصت کے اوقات میں وہ اسے پڑھ کر روتے بھی تھے(دروقتِ فرصت آں مطالعہ می کردو گریست)۔(۲۷)اسی طرح اس کتاب میں یہ واقعہ بھی منقول ہے کہ شہزادہ عظیم الشان نے شاہ عبدالرحیم کے نام نہایت عجز وانکساری سے بھر پور خط لکھ کر زیارت کی خواہش ظاہر کی اور عرض کیا کہ اگر آپ خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے قصد سے تشریف لائیں اور اس بہانہ ہماری ملاقات ہو جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔شاہ صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا:''ان اللہ لا ینظر الی صورکم واعمالکم وانما ینظر الی قلوبکم و نیاتکم،بامثال ایں امور فریفتہ نمی شوم''،(۲۸)(بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے اعمال کو نہیں دیکھتا،وہ تمہارے دلوں اور تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔میں آپ کی چکنی چپڑی باتوں کے فریب میں نہیں آسکتا۔)

مزید برآں شاہ ولی اللہ اپنے والد گرامی کے معمولات کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

''حضرتِ ایشاں بخانۂ امرانمی رفتند وایں باب رابکلّی مسدود ساختہ، اگر نصیحت می خواستند بنہایت رفق ولین ادا می نمودند وامر معروف ونہی عن منکر ورسائل منصوصہ بشرطِ ظن قبول برفق ولین می کردند''۔(۲۹)

(حضرت والد ماجد امرا کے گھر نہیں جاتے تھے اور یہ دروازہ اپنے لیے بالکل بند رکھا تھا۔ اگر یہ لوگ آپ کی زیارت کے لیے آتے تو آپ بہت ہی اخلاق سے پیش آتے اور سربراہانِ قوم کو خاص اکرام واعزاز سے نوازتے تھے۔ اگر یہ نصیحت کی درخواست کرتے تو انتہائی مہربانی ونرمی سے آپ یہ فرض انجام دیتے تھے)۔(۳۰)

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''انفاس العارفین'' میں شاہ ولی اللہ نے بادشاہوں سے تعلقات وملاقات کے مسئلہ پر اپنے والد گرامی اور دوسرے بزرگوں کے تاثرات نقل کیے ہیں اور اس ضمن میں کچھ واقعات بھی بیان کیے ہیں لیکن اس بارے میں خود ان کا اپنا کوئی تاثر یا نقطۂ نظر اس کتاب میں نہ مل سکا۔ تاہم یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے مشہور وصیت نامہ (معروف بہ ''المقالۃ الوضیئۃ فی النصیحۃ والوصیۃ'') میں جن مضامین کی کتابیں پڑھنے سے باز رہنے کی نصیحت کی ہے ان میں شعروشاعری، معقولات، بادشاہوں کی تاریخ اور ان کے واقعات سے متعلق کتابیں شامل ہیں اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اگر زمانہ کی رسم یا وقت کا تقاضا ان میں مصروف رہنے کی مقتضی ہو تو اسے علم دنیا تصور کیا جائے اور اس سے دوری اختیار کی جائے۔(۳۱)

بادشاہوں سے براہِ راست ملاقات اور ان کے دربار میں حاضری کے بارے میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے مذکورہ تصورات وتاثرات کے باوجود انفاس العارفین میں بادشاہ وامرا سے خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے روابط کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں بادشاہ کی کامیابی کے لیے دعاء کرنا، ان کا عطیہ قبول کرنا، امرا کی دعوت میں شریک ہونا، افسران حکومت کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرنا، ضرورت مند امرا کے مسائل کے حل کے لیے کوشش کرنا شامل ہے۔ اس ضمن میں صورت حال کی وضاحت کے لیے بعض واقعات نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ایک دفعہ اورنگ زیب باغی افغانوں سے جنگ میں مصروف ہوئے اور کوشش کے باوجود

ان سے جنگ میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔شاہ عبدالرحیم کے بعض قریبی مخلصین نے (جو بادشاہ سے بھی قربت رکھتے تھے)ان سے بادشاہ کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی۔جب اس کے لیے متوجہ ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ ایک معمر بزرگ کی صورت سامنے آرہی ہے جو انہیں اس معاملہ میں دعا کرنے سے منع کررہی ہے۔پھر معلوم ہوا کہ شیخ آدم بنوریؒ کے خلفا میں حاجی یار محمد افغانوں کی حمایت پر کمر بستہ ہیں۔اس کی وجہ سے وہ اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔(۳۲)اسی طرح یہ بات بھی تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم دہلویؒ فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں کچھ عرصہ شریک رہے۔فتاویٰ کا یہ مجموعہ جیسا کہ معروف ہے اورنگ زیب عالمگیر نے علماء کی ایک کمیٹی کے ذریعہ مرتب کرایا تھا جس کے صدر مولانا نظام الدین برہان پوری تھے۔(۳۳)۔ ''انفاس العارفین''میں اس عظیم الشان فقہی تالیف میں شاہ عبدالرحیم کی شرکت وعلیحدگی سے متعلق بہت سی معلومات ملتی ہیں جو دوسرے مآخذ سے کچھ مختلف بھی نظر آتی ہیں۔ان کا خلاصہ یہ ہے:

☆ شاہ عبدالرحیم فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں شیخ حامد (جو ان کے ہم درس رہ چکے تھے) کے معاون کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

☆ شیخ حامد کی تحریک پر شاہ عبدالرحیم کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔انھوں نے اولاً اسے قبول کرنے سے انکار کیا لیکن والدہ کے اصرار پر ایک مقررہ روزینہ پر اسے قبول کرلیا۔

☆ ان کے پیرومرشد خلیفہ ابوالقاسم کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس خدمت سے علاحدگی کی ہدایت کی۔

☆ جب شاہ صاحب نے اس کی وجہ سے والدہ کی ناراضگی کا ذکر کیا تو شیخ نے جواب میں فرمایا: جب اللہ کا حق آجاتا ہے تو بندوں کے حقوق ساقط ہوجاتے ہیں (گفتم والدہ ناخوش می شوند، فرمودند:''اذا جاء حق اللہ ذھب حق العباد'')۔(۳۴)

☆ شاہ عبدالرحیم نے شیخ سے درخواست کی: دعا بکنید کہ حق سبحانہ تعالیٰ ایں وظیفہ دور کند بغیر سعی من تا والدہ ناخوش نشود، دعا کردند (۳۵)۔

(دعا فرمائیں کہ بغیر کسی کوشش کے اس ملازمت سے علاحدگی کی کوئی صورت نکل آئے اور میں والدہ کی ناراضگی سے بچ جاؤں۔شیخ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔)

☆ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے فتاویٰ کی تالیف سے منسلک تمام لوگوں کی فہرست طلب کی اوراس پر نظر ثانی کی۔ جب شاہ عبدالرحیم کا نام آیا تو انھیں وظیفہ خواروں کی فہرست سے کاٹ کر یہ لکھ دیا کہ اگر وہ چاہیں تو اس خدمت کے عوض انھیں اتنی آراضی دے دی جائے۔ جب افسران حکومت نے اس سلسلہ میں ان سے دریافت کیا تو انھوں نے عدمِ قبولیت ظاہر کی۔ اس کی وجہ سے انھیں اس خدمت سے نجات مل گئی، اس پر شاہ صاحب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اس کی حمد وثنا پڑھی۔ (چند روز بعد بادشاہ آسامی اہل وظیفہ طلب کرد، آں را بعزل ونصب تغیرمی داد۔ چوں بنامِ من برسید آں وظیفہ دور کرد ونوشت: اگر خواستہ باشد ایں قدر زمین دہید، مرا پرسیدند، قبول نکردم وشکرانہ بجا دارم وحمد خدائے تعالیٰ)۔ (۳۶)

شاہ صاحب کا نام فتاویٰ عالمگیری کے وظیفہ خوار مؤلفین کی فہرست سے کیوں خارج ہو گیا۔ اس کی بھی کچھ وضاحت "انفاس العارفین" سے ملتی ہے اور وہ یہ کہ فتاویٰ کے بعض تالیف شدہ حصوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے شاہ عبدالرحیم نے بعض غلطیوں کی تصحیح کرتے ہوئے اس پر اپنا تاثر بھی لکھ دیا تھا: "من لم یتفقّہ فی الدین قد خلط فیہ،ھذا غلط و صوابہ کذا" (۳۷) (جسے دین کی صحیح سمجھ نہیں تھی، اس نے اس [عبارت] میں خلط ملط کر دیا ہے، یہ غلط ہے، صحیح اس طور پر ہے) اس کی وجہ سے شیخ نظام (صدر مجلسِ مولفین "فتاوائے عالمگیری) کو بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی اور یہ ان کی ملاّ حامد سے ناراضگی کا بھی باعث بنی۔ اس کے بعد بقول شاہ عبدالرحیم دہلویؒ:

"ملاّ حامد دراں وقت ہیچ نگفت بعد ازاں با من اظہارِ ملال کرد۔ کتابہا کہ ماخذ ایں مسئلہ بود حاضر کردم و اختلال عبارت و پریشانی واضح ساختم بوجہی کہ بر ممکنان (مفتیان؟) ثابت شد ازاں باز اکثر آں قوم بر من حسد می بردند و بظاہر سبب ایں عزل حسدِ ایشاں بودند۔ واللہ اعلم"۔ (۳۸)

(ملاّ حامد نے اس وقت کچھ نہیں کہا، بعد میں اس پر ناراضگی ظاہر کی۔ میں نے [عبارت کا] اصل ماخذ لاکر پیش کر دیا اور عبارت کے اختلال کی صورتِ حال واضح کر دی۔ اس کے بعد یہ لوگ مجھ سے حسد کرنے لگا۔ میری برطرفی کا ظاہری سبب یہ واقعہ بنا۔ زیادہ بہتر اللہ ہی جانتا ہے۔)

فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں شاہ عبدالرحیم کی شرکت وعلاحدگی سے متعلق ''انفاس العارفین'' کی معلومات اس وجہ سے اہم وقیمتی ہیں کہ دوسری کتابوں میں بس اتنا ذکر ملتا ہے کہ وہ فتاویٰ عالمگیری کی تالیف سے وابستہ ہوئے اور شیخ کے کہنے پر اس خدمت سے علاحدگی اختیار کرلی۔

سلاطین وبادشاہوں کے علاوہ امرایا حکومت کے اہم افسران سے بھی خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے روابط کے ثبوت ملتے ہیں اور ''انفاس العارفین'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادہ کے بزرگوں کے معتقدین ومریدین میں شاہی دربار کے متوسلین بھی شامل تھے۔ شیخ فرید بخاری (نواب مرتضیٰ خاں) عہد اکبری وجہانگیری کے بااثر ممتاز امرا میں سے تھے،(۳۹) شاہ عبدالرحیم کے نانا شیخ رفیع الدین محمد سے بہت گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک عمارت کی تکمیل پر شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ ان کی درخواست پر شیخ رفیع الدین محمد بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔(۴۰) اسی دور کے امرا میں خان عالم جنہیں جہانگیر نے ایران کا سفیر نامزد کیا تھا، شیخ رفیع الدین محمد کے معتقدین میں سے تھے اور انھوں نے باقاعدہ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی،(۴۱) عہد عالمگیری کے ایک اہم افسر حکومت ہدایت اللہ بیگ شاہ عبدالرحیم کے حلقۂ ارادت سے منسلک تھے، کسی وجہ سے بادشاہ نے انھیں معزول کردیا، مرشد سے ملازمت کی بحالی کے لیے دعا کی درخواست کی، انھوں نے دعا فرمائی جسے قبولیت نصیب ہوئی، نہ صرف یہ کہ ان کا عہدہ دوبارہ انھیں مل گیا بلکہ ان کے منصب میں ترقی بھی ہوگئی (بادشاہ گفت تقصیر فلاں معاف کردیم ومنصب او بحال داشتیم وایں قدر اضافہ دادیم)۔(۴۲) محمد قلی عہدِ عالمگیری میں مغل فوج کے ایک سپاہی تھے، ایک اہم مہم کے دوران کافی عرصہ تک ان کی کوئی خیر وخبر نہیں ملی تو ان کے بھائی محمد سلطان نے شاہ عبدالرحیم سے رجوع کیا اور دعا کی درخواست کی۔ شیخ نے پوری توجہ کے ساتھ دعا کی اور یہ بارآور ثابت ہوئی۔(۴۳) اسی دور میں مرزا زاہد ہروی شاہی لشکر کے محتسب تھے، وہ درس وتدریس میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔(۴۴) شاہ عبدالرحیم نے اکبرآباد (آگرہ) میں ان سے بعض کتابوں کا درس لیا۔ اس موقع پر ملّا حامد ان کے ہم درس رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے بیان کے مطابق وہ بھی اپنے والد کے ہمراہ اکبرآباد گئے تھے۔(۴۵)

اوپر کے مباحث سے انفاس العارفین کی روشنی میں خانوادۂ شاہ ولی اللہ اور اہل حکومت (سلاطینِ دہلی ومغل بادشاہوں) کے مابین تعلقات وروابط کے بہت سے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نقشبندی صوفیہ بادشاہ وامرا سے روابط رکھنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے گرچہ اس سلسلہ کے مشائخ شاہی دربار میں حاضری اور بادشاہوں سے ملاقات پسند نہیں کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم اور دوسرے بزرگوں کے معتقدین ومریدین کی شاہی دربار و سرکاری ملازمت سے وابستگی کے واقعات سے بہرحال یہ ثابت ہوتا ہے کہ تصوف سے اشتغال یا کسی صوفی سے نسبت اور شاہی خدمت یا سرکاری ملازمت میں کوئی تضاد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ زیر بحث موضوع سے متعلق جو معلومات اس کتاب میں دستیاب ہیں وہ اس لحاظ سے بھی کافی اہم ہیں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مولفِ گرامی کے علم میں ذاتی طور پر آئیں یا اپنے والد اور دوسرے بزرگ معاصرین کے توسط سے انھیں معلوم ہوئیں۔ مذکورہ مباحث سے اصولِ تاریخ نگاری کے بھی بعض اہم پہلو سامنے آتے ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

☆ تاریخی واقعات یا روایات کو نقل کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے عام طور پر مآخذ کے ذکر کا اہتمام کیا ہے۔

☆ انھوں نے سب سے زیادہ روایتیں اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے نقل کی ہیں۔

☆ صوفیہ ومشائخ کے واقعات بیان کرتے ہوئے راوی کی حیثیت سے ان کے کسی مرید کا نام لکھا ہے اور کہیں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ فلاں بزرگ کے معتقدین کی ایک جماعت سے یہ سنا۔

☆ متعدد مقامات پر راوی کی حیثیت سے صاحب واقعہ کے بیٹے یا پوتے کا نام درج کیا ہے۔

☆ بعض مقامات پر روایت نقل کرنے میں دو دو واسطوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اس طور پر کہ: ”حضرت والد ماجد شیخ آدم بنوریؒ کے رفقا سے نقل کرتے ہیں“۔

☆ کہیں کہیں بالکل مجہول انداز میں لکھا ہے کہ ”شنیدہ می شود“ (سننے میں یہ آیا ہے)۔

ان سب کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ واقعات کو نقل کرنے میں انھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور بہت سے مقامات پر واقعہ نقل کرنے کے بعد ”واللہ اعلم یا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال“ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ طریقہ انھوں نے خاص طور سے ماضی کے ان واقعات کے ضمن میں اختیار کیا ہے جو بہت زیادہ تعجب خیز معلوم ہوتے تھے یا جن کا کوئی متعین ماخذ یا ذریعۂ معلومات انھیں نہیں مل سکا تھا یا جن کی صحت قطعی طور پر ان کے سامنے واضح نہیں تھی۔ ان سب کے

باوجود حقیقت یہ ہے کہ ''انفاس العارفین'' میں منقول متعدد روایات و واقعات تاریخی طور پر تحقیق طلب اور درایتی لحاظ سے قابل غور ہیں، یہاں ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔

آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انفاس العارفین میں جو روایات و واقعات مذکور ہیں ان کے مطالعہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان سے مؤلف گرامی نے اپنے آباو اجداد کی بزرگی، پرہیزگاری، دعاؤں کے اثرات اور ان کی کرامتیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بات اس کتاب کی تالیف کے مقصد کے مطابق نظر آتی ہے، اس لیے کہ جیسا کہ معروف ہے، اس کتاب کی تالیف سے ان کا مقصود اپنے آباو اجداد کی علمی و دینی خدمات کو اجاگر کرنا اور ان کی روحانی زندگی کی ترقی کے مظاہر سے لوگوں کو روشناس کرانا تھا۔ اللہ رب العزت بزرگانِ دین کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ہمیں ان کی نیک خدمات سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(اللہ تعالیٰ استاد گرامی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔ یہ مضمون انہی کی سربراہی میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ''شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی خدماتِ سیرت و تاریخ'' پر ۱۰۔۱۱ نومبر ۲۰۰۶ء کو منعقدہ سیمینار میں پیش کیا گیا تھا۔ نظر ثانی و توسیع کے بعد اسے لائق اشاعت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔)

حواشی و مراجع

(۱) ملاحظہ فرمائیں: خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء؛ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، اشتیاق حسین قریشی، علما اِن پالیٹکس (انگریزی)، رینیسانس پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء۔ (۲) اہل حکومت سے تعلقات پر چشتی و سہروردی صوفیہ کے نقطۂ نظر پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں: Khaliq Ahmad Nizami, Some Aspects of Religion and Politics in India during the Thirteenth Century, Delhi.1974pp.240-256 شیخ احمد سرہندی اور اہل حکومت سے تعلقات کے بارے میں معلومات کے لیے ملاحظہ کریں: راقم کا مقالہ ''شیخ احمد سرہندی اور اہل حکومت میں شریعت کی ترویج''، در: فکر اسلامی کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کی خدمات (سیمینار مقالات، مرتبہ عبدالعلی وظفر الاسلام)، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۶۳ - ۹۴۔ (۳) سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ۵/۳-۷۔ (حاشیہ نمبر ۱) شاہ ولی اللہ دہلوی، انفاس العارفین (اردو ترجمہ: سید محمد فاروق قادری) مکتبہ الفلاح، دیوبند (بدون تاریخ ص ۱۵۵ - ۱۵۸)۔ (۴) انفاس العارفین کا اردو ترجمہ (از سید محمد فاروق قادری) مکتبہ الفلاح، دیوبند (بدونِ تاریخ) اور تصوف فاؤنڈیشن، لاہور سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ (۵) یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بہت سے جدید مورخین نے ''انفاس العارفین'' کے حوالہ سے دہلی سے روہتک کا فاصلہ تیس میل بیان کیا ہے جبکہ شاہ ولی اللہ نے ''سی کروہ'' استعمال کیا ہے (انفاس العارفین، مطبع احمدی، دہلی، بدونِ تاریخ ص ۱۵۲)۔ ایک ''کروہ'' (یا کوس)، جیسا کہ معروف ہے، تقریباً دو میل کے برابر ہوتا ہے۔ بعض جدید ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں دہلی سے روہتک کا فاصلہ تقریباً ۷۰ کلومیٹر مندرج ہے۔ یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (۶) Encyclopedia of the District Gazetteers of India, New Delhi, 1997, 3/205 شاہ ولی اللہ دہلوی، انفاس العارفین، مطبعِ احمدی، دہلی، بدونِ تاریخ، ص ۱۵۲۔ (۷) تاریخ دعوت و عزیمت، محولہ بالا، ۵/ ۶۷-۶۸؛ محمد یٰسین مظہر صدیقی، 'شاہ ولی اللہ دہلوی کی شخصیت و حکمت' کا ایک تعارف، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء، ص ۳؛ مجیب اللہ ندوی، فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین، تاج کمپنی، دہلی، بدون تاریخ، ص ۴۴ (حاشیہ نمبر ۱)۔ (۸) A.D. Muztar, Shah Waliullah - A Saint, Scholar of Muslim India, Islamabad, 1979, p. 13& F.Note No. 3۔ (۹) انفاس العارفین، محولہ بالا، ص ۱۶۳۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۴۵۔ (۱۲) انفاس العارفین، ص ۱۶۹۔ (۱۳) انفاس العارفین، ص ۵۹، انفاس العارفین (اردو ترجمہ از: سید محمد فاروق قادری) مکتبہ الفلاح، دیوبند (بدون تاریخ، ص ۱۳۸ - ۱۳۹ (آئندہ اردو ترجمہ کا حوالہ ''سید محمد فاروق قادری'' سے)۔ (۱۴) انفاس العارفین، ص ۱۵۳۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۵۲۔ (۱۶) ایضاً، ص ۱۵۳، نیز دیکھیے: سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، محولہ بالا، ۵/ ۶۹-۷۱۔ (۱۷) انفاس العارفین، ص ۱۵۸ - ۱۵۹، سید محمد قادری، ص ۳۴۲ - ۳۴۳۔ (۱۸) ایضاً، ص ۱۶۰ - ۱۶۱، سید محمد فاروق قادری، ص ۳۴۵ - ۳۴۶۔ (۱۹) ایضاً، ص ۱۵۶۔ (۲۰) ایضاً، ص ۱۵۶۔ (۲۱) شیخ آدم بنوریؒ پر تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سید عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ۵/ ۱-۲؛ دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو اسلامی انسائیکلوپیڈیا)، لاہور، ۱۹۶۴ء، ۱/ ۲۷-۲۹۔ (۲۲) انفاس العارفین، ص ۱۳۔ (۲۳) ایضاً، ص ۵۵۔ (۲۴) ایضاً، ص ۸۸۔ (۲۵) ایضاً، ص ۶۸۔ (۲۶) سید محمد فاروق قادری، ص ۱۵۴ - ۱۵۵۔ (۲۷) ایضاً،

ص ۶۸۔(۲۸)ایضاً ص ۶۸۔(۲۹)ایضاً ص ۸۴۔(۳۰)سید محمد فاروق قادری ص ۱۸۸۔۱۸۹۔(۳۱)شاہ ولی اللہ دہلوی، المقالۃ الوضیئۃ فی النصیحۃ والوصیۃ (مشمولہ مجموعہ وصایا اربعہ)، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء ص ۵۳۔(۳۲)انفاس العارفین، ص ۶۲، سید محمد فاروق قادری ص ۱۴۳۔۱۴۴۔(۳۳)فتاویٰ عالمگیری کی تالیف کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی محولہ بالا کتاب ''فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین''، ص ۱۳۔۳۰ Zafarul Islam, Fatawa-i-Alamgiri and Its Juridical and Historical Importance, Hamdard Islamicus 38/3July-Sep2015,PP:7-31 (۳۴)انفاس العارفین، ص ۲۴، سید محمد فاروق قادری ص ۴۷۔(۳۵)ایضاً ص ۲۴؛ سید محمد فاروق قادری، ص ۴۷۔(۳۶)ایضاً۔(۳۷)ایضاً۔(۳۸)ایضاً۔(۳۹)شیخ فرید کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: محمد اکرام، رود کوثر، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۷ء ص ۱۷۸۔۱۸۹۔(۴۰)انفاس العارفین، ص ۱۶۷؛ سید محمد فاروق قادری، ص ۳۵۴۔۳۵۵(۴۱)انفاس العارفین، ص ۱۶۸۔(۴۲)انفاس العارفین، ص ۵۸؛ سید محمد فاروق قادری، ص ۱۳۶۔۱۳۷۔(۴۳)انفاس العارفین، ص ۶۰؛ سید محمد فاروق قادری، ص ۱۴۰۔۱۴۱(۴۴)محمد زاہد ہروی کے حالات کے لیے ملاحظہ کریں: رحمان علی خاں، تذکرہ علماء ہند (اردو ترجمہ: محمد ایوب قادری)، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء ص ۴۲۹؛ سید عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخواطر محولہ بالا، ۳۰۶/۶۔۳۰۹؛ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزمِ تیموریہ، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء، ۲۱۶/۲۔۲۱۷۔(۴۵)انفاس العارفین، ص ۱۴؛ سید محمد فاروق قادری، ص ۵۶۔

رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین

☆ جناب ٹی۔آر۔رینا

(۲)

تحقیق کیسا عمل ہے: تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیونکہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوتی ہے۔(ایضاً،ص ۱۴)

کیا تحقیق میں دعوے اور بیانات پر اعتماد کرنا چاہیے؟

''تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابل قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابل اعتماد ہو، قابل اعتماد ہونا، مختلف حالات میں مختلف امور پر منحصر ہوسکتا ہے''۔(ایضاً،ص ۱۴)

کیا تحقیق میں تنقید کا دخل جائز ہے؟

خاں صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر مختلف لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں، جب کہ تحقیق میں اختلاف رائے کی اس طرح گنجائش نہیں۔

اس زمانے میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جائیں جو اصلاً تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ تحقیق اور

☆ ایف ۲۳۷، لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی، جموں۔ ۱۸۰۰۰۵، موبائل: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲۔

تنقید دونوں کی حق تلفی ہے۔تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا دائرۂ کار محدود ہوتا ہے۔
تحقیق، بنیادی حقائق کا تعین کرے گی اوران کی مدد سے ایسے نتائج نکالے جاسکیں گے
جن میں شک یا قیاس یا تاویل یا ذاتی رائے کا عمل دخل نہ ہو۔اخذ نتائج میں جہاں
سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اوران پر مبنی اظہار رائے کا پھیلاؤ شروع ہوگا،
وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہوجائے گی‘‘۔(ایضاً،ص ۱۷)

تحقیقی کاموں میں زبان کا استعمال کیسا ہونا چاہیے؟

’’تحقیق کی زبان کوامکان کی حدتک آرائش اورمبالغے سے پاک ہونا چاہیے
اورصفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔اردو میں تنقید جس
طرح انشاپردازی کا آرائش کدہ بن کررہ گئی ہے، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے
کافی ہےاورتحقیق کواس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے‘‘۔(ایضاً،ص ۱۹)

خاں صاحب کا یہ مضمون پہلی بار’’آج کل‘‘تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اسے ان کی کتاب’’ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ‘‘ میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں جین صاحب نے’’تحقیق کا فن‘‘ نامی کتاب مرتب کرنا شروع کی جو ۱۹۸۷ء میں مکمل ہوئی۔یعنی خاں صاحب کے مضمون کی اشاعت کے ٹھیک بیس سال بعد اس وقت تک ادب کے ہر شعبے میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ یورپ میں نئی نئی تحریکیں وجود میں آرہی تھیں۔ ان کے نئے نئے اصول ہندوستانی ادب میں منتقل ہورہے تھے۔جدید سائنسی اصولوں کی روشنی میں نئے نئے موضوعات پر کتابیں مرتب ہورہی تھیں۔قدیم ادبی روایات میں حذف واضافے ہورہے تھے۔نئی نئی اصطلاحیں ادب میں جگہ پارہی تھیں۔

رشید حسن خاں تحقیق میں مشرقی روایات کے طالب علم تھے۔وہ تحقیق میں محمود شیرانی کو معلم اول اور قاضی عبدالودود کو معلم ثانی مانتے تھے۔ ان کے علاوہ اس روایت کے امین تھے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اورمولانا امتیاز علی خاں عرشی۔

انیسویں صدی کی آخری تین اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں جن حضرات نے ادب کو اپنے افکار سے متاثر کیا وہ ہیں سرسید،مولوی نذیر احمد،شبلی،حالی اورآزاد مگر ان میں سے کسی نے

بھی وہ مزاج نہیں پایا تھا جس کو تحقیق سے حقیقی مناسبت ہوتی ہے، اصل میں تحقیق میں یہی مناسبت ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

خاں صاحب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ وہ واقعی مشرقی تحقیقی روایت کے پیروکار تھے:

''ایک دلچسپ لیکن معنی خیز اتفاق کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک فارسی اور اردو میں تین بڑے محقق ہیں: مرزا محمد قزوینی، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود، اور ان تینوں حضرات کی ذہنی تربیت یورپ میں ہوئی۔ قزوینی مرحوم تو جب ایک بار یورپ گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔ شیرانی صاحب اور قاضی صاحب دونوں قانونی تعلیم حاصل کرنے وہاں گئے تھے۔ شیرانی صاحب نے قانونی تعلیم حاصل کی لیکن اسے مکمل نہیں کرسکے، قاضی صاحب نے اسے مکمل بھی کرلیا۔ تحقیق کے آداب و احوال کا صحیح معنی میں عرفان ان حضرات کو وہیں ہوا اور یہ دونوں صاحبان قابل ذکر مدت تک وہاں رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان تینوں حضرات کے یہاں جو منطقیت اور غیر جذباتی انداز ہے وہ دوسروں کے یہاں اس طرح نہیں پایا جاتا''۔ (یہ مضمون حافظ محمود شیرانی سمینار منعقدہ بہار اردو اکادمی، ۸۔ بی شری کرشنا پوری، پٹنہ۔ ۱، ۳۰، ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں پڑھا گیا۔ بعد میں ان مقالات کو کلیم الدین احمد کے ''پیش لفظ'' کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ خدا بخش لائبریری کا اے سی سی نمبر Acc No-26918 ہے۔ یہ مضمون ان مقالات کے مجموعے کے صفحہ ۲۳ سے ۳۳ پر محیط ہے۔ اب یہ مضمون مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' از راقم الحروف غیر مطبوعہ جلد چہارم کے ص ۵۳۲ تا ۵۴۱ پر محیط ہے)

خاں صاحب تحقیق میں شیرانی صاحب کی اولیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۶ء تک شیرانی صاحب مسلسل لکھتے رہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کی تحریروں نے نئی بصیرت کی آبیاری کی، صحیح معنی میں تحقیق کی روایت کی تشکیل ہوئی، تحقیق کے معیار و مقصود کا تعین ہوا، اس کے

طریقہ کار کی تفصیل سامنے آئی، لیکن ان کی زندگی میں ان کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہو سکے۔ روایت بنی، لیکن پھیل نہیں سکی۔ اثرات پڑے، لیکن دائرہ چھوٹا رہا۔ حسن اتفاق ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے اس زمانے میں ایک طرف تو اس روایت کی توسیع کی اور دوسری طرف ان میں اضافے بھی کیے، جن کی مدد سے اس روایت کا دائرہ وسیع ہوا۔ شیرانی صاحب کی روایت کے جو اثرات دھندلا چکے تھے، وہ از سر نو روشن ہو گئے"۔ (ایضاً ص ۷ ۳۔ ۵۳۶)

خاں صاحب شیرانی صاحب کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

"شیرانی صاحب نے اصول تحقیق پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کے مختلف مقالوں سے، اصول تحقیق اور طریق کار کی تفصیلات بہ آسانی مرتب کی جا سکتی ہیں......"۔

تحقیق کے طریقہ کار میں جو اجزا اہم حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک "داخلی شواہد کا تعین" بھی ہے۔ شیرانی صاحب کی تحریروں میں اس کی کارفرمائی کے اعلا ترین نمونے ملتے ہیں...... انہوں نے داخلی شواہد کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا:

"ایک حصہ الفاظ اور انداز بیان سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ افراد اور واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے طریق کار میں فرد کے ذاتی رجحانات، معتقدات اور اس کے اپنے بیانات کی جو اہمیت ہے اسی قدر بلکہ اس سے کچھ زیادہ اہمیت ہے خارجی محرکات کی، جن میں تاریخی، سیاسی، تہذیبی سبھی عوامل شامل ہیں اور یہاں انہوں نے مورخ کے طریق کار کو اپنایا۔ لفظوں کے ساتھ بھی انہوں نے زندہ انسانوں جیسا سلوک کیا کہ ان کی تاریخی حیثیت کو اولیت دی۔ کون سا لفظ کس زمانے سے ہم کو ملتا ہے اور پھر کن معنوی اور صوری تغیرات سے دوچار ہوا اور اس تجزیے سے کیا نتائج نکلتے ہیں"۔ (ایضاً ص ۹ ۳۔ ۵۳۸)

خاں صاحب شیرانی صاحب کے تحقیقی اصولوں کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

"خطائے بزرگان کو کسی تاویل کے بغیر ہم خطا ہی مانتے ہیں اور بے تکلف اس کا اظہار کرتے ہیں، عقیدت اور احترام ہمارا راستہ روک نہیں پاتے اور روایت کسی

واسطے سے آئی ہو، ہم پرکھے بغیر اسے قابل قبول نہیں سمجھتے، اس منشور تحقیق کا پہلا سبق شیرانی صاحب ہی نے پڑھایا تھا اور ۲۶۔۲۵ سال تک وہ مسلسل اس کی تکرار کرتے رہے اور ذہن وشعور کو تربیت کرتے رہے''۔(ایضاً ص ۵۳۹۔۴۰)

رشید حسن خاں صاحب کی تحقیقی علمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ وہ حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اول مانتے ہیں، مگر بعض مقامات پر شیرانی صاحب نے جو زبان و بیان کا انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''بعض مقامات پر وہ محمد حسین آزاد کی طرح استعارے کا سہارا لیتے ہیں اور اس کا تعلق ادائے مفہوم کے تقاضے کے مقابلے میں حسن بیان اور آرائش گفتار سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر وہ ایسا انداز بیان اختیار کرتے ہیں جو اس لفظی کفایت شعاری سے مطابقت نہیں رکھتا، جس کا تحقیق مطالبہ کرتی ہے۔ مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ انہوں نے آزاد اور شبلی کی کتابوں کا تحقیق کی روشنی میں جائزہ لیا لیکن وہ ان دونوں اساطین کے اسالیب سے متاثر ضرور تھے''۔(ایضاً ص ۵۴۰)

رشید حسن خاں صاحب نے فن تحقیق سے متعلق اساتذہ کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے آپ کو سخت اصول پرست بنالیا تھا۔ تحقیقی اصولوں سے متعلق اگر شیرانی صاحب یا قاضی صاحب سے کہیں ذرا سی لغزش ہوگئی تو وہ احتراماً ان کی گرفت کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے، شیرانی صاحب کی مشہور کتاب ''پنجاب میں اردو'' سے متعلق وہ یوں رقم طراز ہیں:

''ان کی مشہور کتاب پنجاب میں اردو کی لسانی مباحث کے لحاظ سے کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق تو ماہرین لسانیات ہی صحیح رائے دے سکتے ہیں، میرا یہ منصب نہیں، لیکن اصول تحقیق کے لحاظ سے اس کتاب میں یہ بات بہت کھٹکتی ہے کہ انتساب کلام کے ذیل میں انہوں نے بہت سی ایسی روایتوں کو بھی بلا تکلف قبول کرلیا ہے اور بنائے استدلال بنایا ہے، جن کو خود ان کے مقرر کردہ اصول کے تحت، قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے یہ طے کرلیا تھا کہ ایک خاص علاقہ بہر صورت اردو کا مولد ومنشا ہے اور اس بنا پر یہ صورت حال پیدا ہوئی۔

اس سے دو اہم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں: ایک تو یہ کہ تعلق خاطر اور طے شدہ نقطہ نظر کا جہاں بھی عمل دخل ہوگا، وہاں تحقیق کا عمل دھندلا جائے گا، وہ محقق شیرانی صاحب ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت جب میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو دراصل تحقیق کے اولین استاد شیرانی صاحب ہی کے سکھائے ہوئے اصولوں کو دہرا رہا ہوں۔ یہ بات انہی نے سکھائی تھی کہ قابل اعتراض اور ناقابل قبول بات جو بھی کہے، وہ مولانا شبلی ہوں یا حافظ محمود خاں شیرانی، اس کو واضح طور پر رد کرنا اور ناقابل قبول کہنا چاہیے، اس کے بغیر تحقیق کا مسلسل عمل اپنی افادیت کو برقرار نہیں رکھ پائے گا"۔ (ایضاً،ص ۱۴۱۔ ۵۴۰)

رشید حسن خاں صاحب نے قاضی عبدالودود صاحب کو تحقیق کا معلم ثانی کہا ہے۔ ان سے متعلق خاں صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمائیں، تاکہ یہ بات صاف ہوجائے کہ موجودہ دور کے محقق حضرات ان کے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کررہے ہیں یا کہ نہیں:

"قاضی عبدالودود کو اردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل، تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا رجحان بڑھا ہے، شک کرنے یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعوؤں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہو رہا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے اور زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اعتباری کی سند پائی ہے، اس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی بے لچک شخصیت، ان کے بے جھجک انداز گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور پیرایۂ اظہار میں انشا پردازی، مرصع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجائش نہیں۔ انھوں نے سچ بولنا سکھایا، مگر اس سے بڑا کام یہ کیا کہ سچ بولنے کا مطالبہ کرنے کو لازم قرار دیا، یہ بہت بڑا کام تھا"۔ (ششماہی غالب نامہ، قاضی عبدالودود نمبر، جنوری ۱۹۸۷ء)

بعض محققین حضرات کی کتابوں اور تحریروں پر قاضی صاحب نے سخت گرفت کی تھی، جس کی وجہ سے ان سہل نگاروں نے ان کی تحقیق کو منفی قرار دیا اور یہ کہا کہ یہ ہمیشہ عیب نکالتے رہتے ہیں۔ انہی لوگوں نے ادب میں تعمیری اور تخریبی تحقیق کی اصطلاحیں تراش لیں۔ حالانکہ تحقیق میں ان کا رہبری کرنا ہمیشہ مقصد رہا ہے۔

تحقیق، تحقیق ہوتی ہے ادب میں تعمیری و تخریبی جیسی اصطلاحیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جین صاحب نے جب تحقیق کے فن پر کتاب مرتب کرنی شروع کی تو اردو میں ان کے سامنے عبدالرزاق قریشی کی مبادیات تحقیق، ممبئی ۱۹۸۰ء، پروفیسر کلب عابد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی عماد التحقیق، ۱۹۷۸ء، ڈاکٹر شین اختر کی تحقیق کے طریقۂ کار، ۱۹۸۶ء، ڈاکٹر عبدالستار دلوی بمبئی یونیورسٹی کی ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریق کار، ۱۹۸۵ء، رشید حسن خاں کا مجموعۂ مضامین ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، دہلی ۱۹۷۸ء، ڈاکٹر خلیق انجم کی متنی تنقید، دہلی ۱۹۶۷ء، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی اصول تحقیق و ترتیب متن، ۱۹۷۷ء، خدا بخش لائبریری کا مجموعۂ تدوین متن کے مسائل، ۱۹۸۱ء کے علاوہ ایک ضخیم مجموعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء موجود تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی کی ۳۳ اور ہندی کی دس کتابوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تب جا کر تحقیق کا فن جیسی کتاب منظر عام پر آئی۔

تحقیق میں رشید حسن خاں صاحب کا دائرہ اردو و فارسی تک محدود رہا، وہ کبھی کبھی عربی ادب کی حدود میں بھی داخل ہو جایا کرتے تھے۔ شیرانی و قاضی صاحب کی طرح، مگر جین صاحب کا دائرۂ کار عربی، فارسی، اردو، ہندی کے علاوہ انگریزی ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی وجہ تھی ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں۔ انہوں نے تحقیق، تنقید، تدوین اور لسانیات کی کڑیوں کو ملا دیا ہے، گو یہ بات کسی حد تک ہی درست ہے۔

مگر خاں صاحب محقق کے لیے نقاد ہونا ضروری نہیں سمجھتے، جب کہ نقاد کے لیے محقق ہونا لازم قرار دیتے ہیں۔ نقاد اپنی بات پیش کرتے ہوئے آزادی سے دلائل کا سہارا لے سکتا ہے جب کہ محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لیے شواہد پیش کرے اور وہ بھی ایسے جو قابل اعتماد اور قابل قبول ہوں۔

رشید حسن خاں عربی، فارسی اور اردو کی کوئی سند نہ ہونے کے باوجود ایک عالم تھے۔ تحقیق سے

ان کے مزاج کو اس قدر مناسبت تھی جس کی مثال پوری تحقیقی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے مزاج کا پٹھانی کھردرا پن تحقیق کے میدان میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ تحقیق کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی کی آسائشوں اور سماجی ذمہ داریوں تک کو قربان کردیا۔ وہ بے لاگ، مصلحت کوشی سے دور، بے باک محقق تھے جس کی وجہ سے انہوں نے ادب میں دوست کم اور دشمن زیادہ بنا لیے تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں انہوں نے اپنی زندگی کے ۳۶ سال گزارے۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں وہ دہلی سے شاہجہاں پور اپنے آبائی شہر لوٹ آئے۔ ۲۶ر فروری ۲۰۰۶ء کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے لیکن کسی بھی ادارے نے ان کی یاد میں ایک آدھے دن کا سمینار منعقد نہیں کیا۔

پروفیسر حسن عباس ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور واحد ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے ۱۶ر جولائی ۲۰۱۷ء کو وہاں بعنوان ''رشید حسن خاں: محقق اور مدون'' ایک کلیدی خطبے کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے راقم کو جموں سے اور صدارت کے لیے ڈاکٹر شمس بدایونی کو بریلی سے دعوت دی گئی۔

جس طرح قومی اور علاقائی سطح کی سیاسی گروہ بندیاں ہیں، ٹھیک اسی طرح کی ادبی گروہ بندیاں بھی منظم ڈھنگ سے کام کررہی ہیں۔ کون سا علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سمینار کہاں منعقد کرنا ہے، ان میں کن کن حضرات کو دعوت دینے کے علاوہ کن کن حضرات کو انعامات واعزازات سے نوازا جانا ہے، یہ سب ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل میں لایا جاتا ہے۔ اتنے پر ہی بس نہیں بیرونی ممالک کے ادبی سفر کے لیے کن حضرات کا انتخاب کرنا ہے یہ بھی یہی ممبران طے کرتے ہیں۔

اس کی عمدہ مثال یہ ہے کہ ایک بار ایک ادبی گروپ انگلستان کے سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا، اس میں رشید حسن خاں صاحب کا نام بھی شامل تھا اور اس کی اطلاع انہیں دے دی گئی تھی۔ عین آخری وقت پر ان کا نام فہرست سے خارج کردیا گیا، کیونکہ اس گروپ میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ خاں صاحب کسی زمانے میں ان کی شاعری سے متعلق لکھ چکے تھے۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے صرف اتنا کہا:

''سچ کہنے کی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی''۔

رشید حسن خاں صاحب اور گیان چند جین صاحب کے ادبی رشتے کی بنیاد علمیت پر استوار تھی۔ دونوں حضرات ایک دوسرے کا نہایت احترام کرتے تھے۔ مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ

حضرات قطب شمالی وقطب جنوبی کی طرح نظر آتے ہیں۔خاں صاحب ایرانی یوسف زئی خاندان کے سنی پٹھان تھے، جوتلوار کی کاٹ کے لیے مشہور تھے۔انہوں نے شاید ہی زندگی میں کبھی تلوار کو ہاتھ لگایا ہو،لیکن ان کے قلم کی کاٹ کے زخم صدیوں تک، یہ مذہبی بت شکن تو نہیں تھے،مگر ادبی بت شکن ضرور تھے۔جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

جین صاحب کی طبیعت ومزاج ان سے بالکل متضاد تھا۔وہ جین مذہب سے تعلق رکھتے تھے جن کے اصول کے مطابق کسی چھوٹے سے چھوٹے جانور کو نقصان پہنچانا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں سے ایسا نہیں لگتا کہ ان سے کسی حضرت کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو۔ ادبی سطح پر انہوں نے کبھی کسی پر سیدھا حملہ نہیں کیا۔گو شاید ان کی آخری کتاب ”ایک بھاشا، دولکھاوٹ، دوادب“ چند ادبی حضرات کی دل آزاری کا سبب بنی ہو۔ان حضرات نے بھی ان کی زندگی ہی میں مضامین اور کتابوں کی صورت میں اپنے دل کا غبار نکال دیا جس سے حساب برابر ہو گیا۔

خاں صاحب اور جین صاحب کی مذہبی زندگی کا اگر آپ بغور مطالعہ کریں تو دونوں میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے۔دونوں اپنے اپنے مذہبی عقیدوں پر عمل کرنے کے باوجود خدا کی ہستی سے منکر نظر آتے ہیں۔راقم دونوں کی تحریروں سے ایک ایک ثبوت پیش کرتا ہے۔جین صاحب اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر پرتو روہیلہ میں لکھتے ہیں:

> ”خدا (جس کے وجود کا میں بالکل قائل نہیں) آپ کو خوش وخرم رکھے“۔

مذہبی معاملات میں تنگ نظر نہیں پھر بھی جین دھرم کی فضیلت کا وہ یوں ذکر کرتے ہیں:

> ”خوش قسمتی سے میرے چھوٹے سے جین دھرم کے سوا اور کوئی دھرم دوسرے دھرم کو مٹھی بھر زمین دینے کو تیار نہیں“۔(”ایک بھاشا، دولکھاوٹ، دوادب“، گیان چند جین، ص ۴۰)

زندگی کے تجربے اور تاریخی مطالعے نے مذہبی معاملات میں ان کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”مذہب انسان کی اخلاقی اور روحانی رہبری کے لیے بنایا گیا ہوگا لیکن انسانوں کے ہاتھ میں پڑ کر یہ برکت کے بجائے ایک لعنت بن گیا ہے۔اس نے جس شدت

کے ساتھ انسانوں کو بانٹا ہے، جنگیں کرائی ہیں، خونی دنگوں کو ابھارا ہے، دوسرے مذہب کی ناتواں مستورات کے ساتھ زنا بالجبر کو وحشیانہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے، اتنا کسی اور جذبے کے تحت نہیں ہوا۔ کتنے معاشروں اور حکومتوں نے اپنے مذہب کو دوسروں پر تھوپا ہے اور دوسروں کے مسلک کو کچلا ہے۔ جب مذہب کی جکڑ زیادہ شدت اختیار کرلیتی ہے تو وہ بنیاد پرستی بن جاتی ہے۔ وہ انحراف کو برداشت نہیں کرسکتی"۔ (ایضاً، ص ۴۰)

میرے نزدیک مذہب انفرادی طور پر روحانی ترقی اور ذہنی سکون کے لیے ہے۔ جب یہ اجتماعی صورت اختیار کرلیتا ہے تو لاکھوں زندگیاں تلف ہوجاتی ہیں اور خون کے دریا بہائے جاتے ہیں۔

خدا کی ہستی کے متعلق اب رشید حسن خاں صاحب کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے پروفیسر علی احمد فاطمی انہیں وہاں ایک ادبی پروگرام میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ صحت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ معذرت چاہتے ہیں:

"میاں! میری معذرت قبول کرلو خدا (جس کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ ہے تو کہاں ہے) تم کو جنت دے گا اور بہت سی حوریں اگر اچھے دل سے مان لوگے یہ بات۔ برے دل سے مانو گے تو وہاں حوروں کی جگہ غلمان ملیں گے، یاد رکھو"۔ (مکتوب مرقومہ ۲۳/ مارچ ۱۹۹۸ء، شاہ جہان پور سے بنام پروفیسر علی احمد فاطمی۔ مشمولہ "رشید حسن خاں کے خطوط" مرتبہ راقم الحروف، جلد اول، اشاعت فروری ۲۰۱۱ء، ص ۵۳-۷۵۲)

انھی خطوط میں جن حضرات کے ساتھ بے تکلفی تھی، اس طرح کے جملے لکھتے ہیں:

"خدا (اگر وہ کہیں ہے) آپ کو خوش و خرم رکھے"۔

خاں صاحب مختلف اوقات میں جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی دعوت پر چار بار تین تین و چار چار ہفتوں کے لیے تشریف لائے، مختلف موضوعات پر لکچر دینے اور املائی ورک شاپس منعقد کرنے کے لیے اکثر صبح تا دیر رات گئے تک پروفیسر عابد پیشاوری، ڈاکٹر ایم، ایل، پروانہ اور راقم ان کے ساتھ رہے۔ شکر (جمعہ) کے دن طلبہ اور معزز شہری بعد دوپہر نماز کے لیے چلے جاتے تھے۔ ہم

تینوں خاں صاحب کے ساتھ یا تو شعبے میں رہتے یا یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ان کے کمرے میں چلے آتے۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ بیٹھیں میں نماز ادا کرکے آتا ہوں۔ وہ اکثر مذہبی معاملات پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ادبی لحاظ سے ان دونوں شخصیات کا رشتہ کب قائم ہوا وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن خاں صاحب کے خطوط سے ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے کہ ان کا ادبی رشتہ ۱۹۷۴ء سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مکتوب مرقومہ ۶ ر ستمبر ۱۹۷۴ء، ایف ۴/۳۳ ماڈل ٹاؤن، دہلی۔ ۹ سے جین صاحب کو لکھتے ہیں:

"مکرمی!

محبت نامہ ملا تھا.......... اب کب آنے کا ارادہ ہے۔ چاہتا یہ ہوں کہ اب جب آپ یہاں آئیں تو "ہمزہ" کے مسئلے پر آپ سے ذرا تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے، مگر زبانی۔ "ہندوستانی زبان" والا مضمون میں نے پڑھ لیا ہے۔ آپ تو "شعراءِ کرام" اور "شعرائے کرام" کو ایک کر دینا چاہتے ہیں، اس پر یقیناً مجھے کچھ کہنا ہے۔ دو علامتوں کے احتجاج کا تضاد، یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ بہرصورت اس پر کھل کر گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔ (رشید حسن خاں کے خطوط، جلد اول، از راقم الحروف، اشاعت فروری ۲۰۱۱ء، ص ۶۴۷)

خاں صاحب کے خط سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جین صاحب سے خطوط کا سلسلہ پہلے سے قائم تھا۔ ان کے خط خاں صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔ راقم نے خاں صاحب کے خطوط بنام جین صاحب کیلی فورنیا امریکہ سے حاصل کیے تھے۔ اس وقت جین صاحب مستقل طور پر وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ مرحوم رشید حسن خاں صاحب نے کسی بھی مشاہیر ادب میں کسی کا اپنے نام کا ایک بھی خط محفوظ نہیں رکھا، جس سے بہت بڑا ادبی نقصان ہوا۔ ("خاں صاحب کے خطوط" کی جلد اول میں ۵۶ اور جلد دوم میں ایک خط شامل ہے۔ یہ خط ستمبر ۱۹۷۴ء تا مئی ۱۹۸۵ء تک کے ہیں۔)

خاں صاحب جب فسانۂ عجائب مرتب کر رہے تھے تو جب کبھی انہیں کسی جملے یا لفظ سے متعلق الجھن ہوتی تو وہ اکثر جین صاحب سے رجوع کرتے، مثلاً:

"صاحب! جوتے کی ایک اصطلاح سمجھ میں نہیں آ رہی ہے، سرور نے دیباچے

میں اہل لکھنؤ کی فراغ دلی کے بیان میں ''پیر بخارا'' کے شہدے کو پیش کیا ہے کہ وہ بھی اس قدر ہمت والا ہے کہ ''دوے کے دانو پر اڈّھی نہ لگائی......سینکڑوں دانو منجی گئے، منہ سے نہ پنجی گئے''۔ ''منجی'' یا ''منجے'' کے معنی ہیں: دانوں کا خالی جانا۔ لیکن اس لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے اور دوسرے ٹکڑے کا تعین کیسے ہو، اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو مطلع فرمائیے''۔ (ایضاً، ص ۶۸۔۷)

جین صاحب نے اس خط کا جواب ضرور دیا ہوگا، مگر نہ تو خاں صاحب کے اگلے کسی خط میں اس بات کا ذکر ہے اور نہ ہی فسانۂ عجائب کے ضمیمہ تشریحات میں جین صاحب کے نام کا کوئی حوالہ ہے۔

خاں صاحب مکتوب مرقومہ ۲۴/ اگست ۱۹۷۸ء میں اپنے تحقیقی مضامین سے متعلق، جن کے ذریعے انہوں نے اردو شاعری کا انتخاب، دیوان غالب، علی گڑھ تاریخ ادب اردو اور تاریخ ادب (جمیل جالبی) پر گرفت کی تھی۔ لکھتے ہیں:

''حضرات! ادبی دنیا میں اس وقت یہ عجب صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ ہمارے بعض معروف افراد آسان پسندی کے پھیر میں آ گئے ہیں اور دنیا طلبی کے دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں............کثرت تالیف کے پھیر میں آ کر معیار کی طرف سے انہوں نے قطع نظر کو دور رکھا ہے۔ اب یہ آپ کے اوپر ہے کہ اسے تخریب کہیے یا تنقیص، میں بجائے خود ایک ضرورت سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی فرد یا ادارے کی چھٹائی یا بڑائی پر نظر نہیں کی، اپنی بساط بھر صحیح بات کہتا رہا اور اس کے نتیجے میں ساری دنیا سے گویا تعلقات خراب ہو گئے اور اس کے نتائج اب بھی بھگت رہا ہوں، مگر خدا کا شکر ہے کہ پشیمان نہیں اور اپنے نقصانات پر افسوس ضرور ہے مگر یہ احساس ہے کہ اس راہ میں یہی ہوتا ہے۔ جین صاحب! میں نے حق گوئی کی بہت قیمت ادا کی ہے اور ادا کر رہا ہوں، کبھی نیاز حاصل ہوا تو تفصیلی عرض کروں گا''۔ (ایضاً، ص ۶۶۔۷۵)

ایسی باتیں ان سے ہی کہی جاتی ہیں جن سے دلی قربت ہو۔

فسانۂ عجائب کے بعد خاں صاحب نے باغ و بہار کو مرتب کرنا شروع کیا۔ دوران تدوین یہاں بھی انہیں قدیم الفاظ و جملوں سے واسطہ پڑا۔ حالانکہ ان کے پاس بیس لغت موجود تھے۔

ان سے رجوع کرنے کے بعد بھی انہیں جب تشفی نہ ہوتی یا کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ پاتے تو جین صاحب سے بذریعہ خط رابطہ قائم کرتے تا کہ لفظ یا جملے کی صحیح صورت حال سے آگاہی ہو سکے اور اسے شامل متن کیا جا سکے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''ا۔ باغ و بہار کے دوسرے درویش کی کہانی میں، جہاں جوگی کا ذکر ہے، ایک جملہ یہ ہے ''بالوں کا جوڑا باندھا۔ موچھوں پر تاؤ دے کر، چڑھواں جوتا اڑایا''۔ نسخۂ فاریس اور نسخۂ مولوی عبدالحق میں یہی ہے۔ نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں ''اڑایایا'' ہے۔ یہاں واضح طور پر غلطی کتابت ہے۔ یا تو ''اڑایا'' ہوگا یا ''اڑیایا'' روایت اول کا جو عکس میرے سامنے ہے، اس میں ''اڑیایا'' ہے۔ اگر مصدر ''اڑیانا'' مانا جائے تو ''اڑایا'' بنے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اڑیانا یا اڑانا، جوتا پہننے کے معنی میں (ایڑی میں ڈالنا کی نسبت سے غالباً) کہیں آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

۲۔ قصہ خواجۂ سگ پرست میں ایک جملہ یوں ہے ''سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہتا، میری ہی دکان سے جاتا'' (نسخۂ عبدالحق، ص ۱۲۵)، نسخۂ ڈنکسن فاریس میں بھی یہی ہے۔ مگر نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں ''چاہیتا'' ہے (جو تحفہ چاہیتا) میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ یہاں کیا ہونا چاہیے۔ آپ کی رائے اس بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مراد ہے ''جو تحفہ چاہیے ہوتا'' سے، یوں ''چاہتا'' تو بظاہر بے محل معلوم ہوتا ہے اور ''چاہیتا'' میری نظر سے کہیں گزرا نہیں۔ پنجابی یا دکنی میں کیا یہ صورت پائی جاتی ہے؟

اسی داستان میں ایک اور جملہ ہے ''میں تمہارا غلام ہوں، بھائی چاری کا دعویٰ نہیں رکھتا''۔ سب نسخوں میں ''بھائی چاری'' ہے۔ میں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ یہ ''بھائی چارے'' ہوگا۔ یہاں بھی آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ''بھائی چاری'' میری نظر سے کہیں نہیں گزرا نہ کبھی سنا۔ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا''۔

(ایضاً، ص ۸۷۷، خط مرقومہ ۳۱/جنوری ۱۹۸۶ء)

چھے ماہ تک شاید انہیں جین صاحب کا جواب نہیں ملا۔ وہ پھر خط مرقومہ ۱۷/ستمبر ۱۹۸۶ء میں انہی باتوں کو دہراتے ہیں۔ یہاں صرف ایک بات کا انہوں نے اضافہ کیا ہے کہ ''چاہیتا''، پلیٹس کے

لغت میں موجود ہے۔اسی خط کے آخر میں اپنی بات ظاہر کرنے کے بعد ان کی رائے طلب کرتے ہیں:

''اس سلسلے میں آپ کی رائے مطلوب ہے۔یعنی یہاں آپ کی رائے میں مرجح صورت کیا ہونا چاہیے اور کیا ''چاہیتا'' سے چاہیے مراد لیا جاسکتا ہے۔یا یہ مراد ہے کہ سب سرکاروں میں جو (شخص) تحفہ چاہتا؟ ہاں یہ عرض کردوں کہ میں نے ''چاہیتا'' کو ترجیح دی ہے، یوں کہ معنی ''چاہتا'' اور ''چاہیتا'' کے ایک ہیں۔اگر ''چاہیتا'' بہ لحاظ مفہوم یہاں آسکتا ہے تو ''چاہیتا'' بھی آسکتا ہے۔

ازراہ کرم پہلی فرصت میں اپنی رائے سے مطلع فرمایئے۔ممنون ہوں گا''۔

(ایضاً،ص ۷۷۹)

رشید حسن خاں صاحب نے جب لفظ ''اڑایایا'' کو باغ و بہار کے متن میں درج کیا تو اس کے لیے انھوں نے نسخۂ مولوی عبدالحق، نسخۂ فاریس، نسخہ فورٹ ولیم کالج، باغ و بہار کی روایت اول، شاہد احمد دہلوی مرحوم کی گنجینۂ گوہر، کراچی سے شائع شدہ ترقی اردو بورڈ کے لغت کی جلد اول، فرہنگ آصفیہ، نیلن اور پلیٹس کے لغت کے علاوہ جین صاحب اور نیر صاحب جیسی ادبی شخصیات سے معلومات حاصل کیں۔اس لفظ کی مرجح صورت ''اڑایا'' کو تب جا کر انھوں نے متن اور ضمیمۂ تشریحات کے صفحہ ۳۲۸ پر درج کیا ہے۔(باغ و بہار، اشاعت سوم ۲۰۰۹ء)

خاں صاحب نے جتنے بھی کلاسیکی متن مرتب کیے ان میں انہیں کوئی غلطی نظر آتی ہے یا کسی بڑی ادبی شخصیت کی تحریر میں تو وہ اس کی نشان دہی کرنا یا واضح طور پر اس کا تعین کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اپنی بے باکی کو وہ اپنے مکتوب مرقومہ ۲۹؍ستمبر ۱۹۸۶ء کے ذریعے جین صاحب تک یوں پہنچاتے ہیں:

''میرامن کے مختارات سے مجھے اختلاف کا حق حاصل ہے، ان پر اعتراض کرنے کا بھی حق ہے، مگر ان کی عبارت میں ترمیم کا حق نہیں۔اس سلسلے میں میرا ذہن بالکل روشن اور صاف ہے۔واضح غلطی کو نہیں مانا جائے گا، کیونکہ میرا ابھی یہی اصول ہے کہ متن میں صحیح صورت کو جگہ دی جائے، مگر ''غلطی'' کی تعریف میرے نزدیک یہ ہے کہ قطعیت کے اور کامل یقین کے ساتھ اس کا تعین کیا جاسکے۔قدیم زبان اور بیان میں ایسی ایسی صورتیں سامنے آتی رہتی ہیں (خاص کر میرامن کے

یہاں) کہ ہر اجنبی اندراج کو غلط مان لینا، بڑے خطرے کی بات ہوگی۔ اب آپ سے گفتگو ہو تو اس پر مزید بحث ہو۔ آپ ایک بار پھر اس پر غور کر لیجیے۔ خط لکھیے''۔

(''رشید حسن خاں کے خطوط''، جلد اول، ص ۷۸۰)

رشید حسن خاں اور گیان چند جین کا ادبی رشتہ بڑا نازک تھا۔ دونوں بے باکی سے ایک دوسرے کی کمیوں پر گرفت کرتے تھے، مگر تہذیب و اخلاق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے تھے۔ جین صاحب خاں صاحب سے متعلق لکھتے ہیں:

رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کے پیرو ہیں۔ حالیہ دو شاہکار تدوینوں سے پیشتر ان کی شہرت ایک خوردہ گیر محقق کی تھی۔ اس سلسلے کے ان کے بعض مضامین ان کے مجموعے ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' (علی گڑھ ۱۹۷۸ء) میں ملتے ہیں۔ ان میں تین تبصراتی مضامین اہم ترین ہیں۔ دیوان غالب صدی ایڈیشن، اردو شاعری کا انتخاب اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو، تینوں تبصرے یک رخی ہیں یعنی ان میں محض اغلاط دکھائی ہیں، خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

دیوان غالب صدی ایڈیشن کے مرتب مالک رام ہیں۔ اس پر خاں صاحب کا تبصرہ پہلے رسالہ تحریک دہلی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا، بعد میں اردو تحقیق اور مالک رام، نام کی کتاب میں اور تیسری بار ان کے مجموعے ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں۔

خاں صاحب نے یہ تبصرہ بڑی دیدہ ریزی اور عمیق نظر سے لکھا۔ کاش انہوں نے غیر جذباتی رنگ میں لکھا ہوتا اور خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا ہوتا۔ رشید حسن خاں کے اعتراضات اور تجاویز میں سے میں بیشتر سے متفق ہوں بعض سے نہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ جسے اس سے دلچسپی ہو وہ میرا مضمون ''مالک رام بحیثیت ماہر غالبیات'' دیکھ لے جو میرے مجموعے ''ذکر و فکر'' (الٰہ آباد ۱۹۸۰ء) میں شامل ہے۔

دوسرا اہم تبصرہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ ''اردو شاعری کا انتخاب'' پر ہے۔ انتخاب ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے اس میں تحریف متن کے جو نمونے دیے اور انتخاب میں عدم توازن کی نشان دہی کی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ڈاکٹر زور نے خود نہیں بلکہ کسی شاگرد سے کرایا ہے۔ تیسرا شہرت یافتہ تبصرہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر ہے۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ کی

خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مشہور ہے کہ ان کے تبصرے کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی''۔(خصوصی شمارہ کتاب نما،''رشید حسن خاں،حیات اور ادبی خدمات''،اشاعت اول جولائی ۲۰۰۲ء،ص ۶۵)

جین صاحب خاں صاحب سے متعلق لکھتے ہیں کہ''یہ تینوں تبصرے یک رخی ہیں، انہیں جذباتی رنگ میں لکھا گیا ہے۔خامیوں کے ساتھ خوبیوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا''۔انہوں نے علی گڑھ تاریخ ادب سے متعلق بھی خاں صاحب کے سلسلے میں کوئی ایسی بات لکھ دی جس کی بنیاد سچائی پر نہیں تھی۔

اب خاں صاحب کا جواب سنیے:

''اب ایک خاص بات: علی گڑھ تاریخ ادب کے سلسلے میں، جس قول کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ قطعی طور پر صحیح نہیں، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، شعبہ اردو میں ریڈر ہیں۔ وہ اس زمانے میں یونیورسٹی کے دفتر میں اس سکشن کے انچارج تھے، جہاں .V.C کا وہ آرڈر آیا تھا کہ کتابیں بازار سے اٹھالی جائیں اور فروخت بند کردی جائے۔اس آرڈر کو خود انہی نے وصول کیا تھا اور اس پر عمل درآمد کرایا تھا اور کیا تھا۔ میں نے بذات خود یونیورسٹی جا کر سب کے سامنے ان سے صورت حال معلوم کی اور انہوں نے یہ ساری تفصیلات بتائیں۔اگر آپ کہیں گے، تو میں ان سے تحریری بیان بھجوادوں گا۔اصل میں یہ اس تبصرے کی اہمیت کو کم کرنے کی ایک کوشش تھی، یوں کہ یہ تاریخی بات ہے کہ ایک تبصرے کی بنا پر اتنی بڑی اسکیم کی کتاب باضابطہ واپس لے لی جائے۔اس کی کوئی دوسری مثال اردو میں تو ہے نہیں۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو اصل بات کو برقرار رکھیں یا پھر اس جھگڑے ہی کو بیچ میں سے نکال دیں۔اس تبصرے کی اہمیت تو بہر طور سب کے سامنے ہے۔ہاں سردار جعفری کی مرتبہ رباعیاں اور جمیل جالبی کی تاریخ ادب والے تبصرے اور ثقافت پاکستان کے تبصرے بھی توجہ طلب ہیں۔میں اگر مالک رام صاحب کی ادبی خدمات پر مضمون لکھتا تو ضرور دوسرے مسائل سے متعلق اعترافات سے کام لیتا، مگر میں نے تو ایک خاص کتاب پر تبصرہ لکھا تھا اور یوں مجموعی خدمات کا اعتراف کا کوئی محل نہیں

تھااور دیوان بہرحال ان کی شہرت کے مساوی نہیں''۔(''رشید حسن خاں کے خطوط''، جلد اول، ص۲۹۷)

جین صاحب نے اپنے اقتباس میں یہ درج کیا تھا کہ خاں صاحب نے ''خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا ہوتا''۔

خاص صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ میں نے مالک رام صاحب کی ادبی خدمات پر مضمون نہیں لکھا بلکہ ان کی کتاب دیوان غالب پر تبصرہ لکھا تھا۔

خاں صاحب جین صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف ہی نہیں بلکہ دل سے ان کا احترام بھی کرتے تھے۔لیکن بعض معاملات میں وہ ان سے متفق نہیں ہوتے تھے جس کا برملا اظہار وہ اپنے مکتوبات میں گاہے گاہے کردیتے تھے۔ایسی ہی ایک تحریر ذیل میں پیش کی جارہی ہے، جس سے دونوں شخصیات کی ذہنی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایسی تحریروں سے ان کا ادبی رشتہ منقطع نہیں ہونے پاتا بلکہ رواں دواں رہتا ہے:

''آپ کا خط کئی روز کی تاخیر سے مجھے ملا، وجہ یہ تھی کہ میں چندروز کے لیے شاہجہاں پور گیا ہوا تھا۔مسودہ واقعتاً میرے پاس تھا، تاخیر دووجوہ سے ہوئی: ایک تو میری مسلسل علالت، خاص کر آنکھوں کی تکلیف۔دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ مجھے اس مسودے کے سلسلے میں تامل بہت تھا۔آپ سے میرے جیسے مراسم تھے اور ہیں، ان کے پیش نظر میں کئی بار خط لکھتے لکھتے رہ گیا، خیال آیا کہ کہیں اسے آپ میری کافر طبیعتی پر محمول نہ کریں۔آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں نے ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کے سلسلے میں مبارک باد کا خط لکھا تھا تو اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کی اس کتاب سے میرا جی خوش نہیں ہوا ہے، اس لیے کہ اس میں ایسی ہلکی تحریریں بھی ہیں، جنھیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔اور آپ نے اپنے جوابی خط میں اس سے اتفاق کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ ادبی وقار اور عام شہرت، دونوں کے لحاظ سے آپ اس مرتبے پر فائز ہیں کہ اب یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہر طرح کی ہلکی اور گہری معمولی اور عمدہ، ناقابل التفات اور بے حد قابل التفات تحریریں یکساں طور پر آپ سے منسوب ہوتی رہیں۔میں نے

یہ بھی لکھا تھا کہ آدمی دن بھر جو کچھ لکھتا ہے یا کہتا ہے وہ سب لازماً درج رجسٹر ہونے کے لائق نہیں ہوتا۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ اپنی ہر تحریر لازماً شائع کرنا چاہتے ہیں، اور یہ بات میری رائے میں نظر ثانی کی محتاج ہے۔

جو بات میں نے آپ کی اس مطبوعہ کتاب سے متعلق لکھی تھی، وہی بات اس غیر مطبوعہ کتاب کے سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں۔ ہر مہینے ہر طرح کی کتابیں چھپتی ہیں اور چھپتی رہیں گی، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اردو کی نثری داستانیں، شمالی ہند میں اردو مثنوی، تفسیر غالب اور لسانی مطالعے کے مصنف کے نامہ اعمال میں کم درجہ تحریریں مندرج نہ ہونے پائیں۔

یہ خواہش یوں ہے کہ میں آپ کا قدر شناس ہوں اور آپ کو محترم سمجھتا ہوں۔ ہر شخص سے ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔

اس مسودے میں جو تحریریں ہیں، ان میں سے نصف ضرور ایسی ہیں جو بڑی حد تک غیر ضروری ہیں، مثلاً آپ ہی بتائیے کہ امید کے لب گویا کے تبصرے سے اہل نظر کی معلومات میں کیا اضافہ ہوگا، شاعر بھی معمولی اور اس کے مجموعے پر تبصرہ اس سے بھی زیادہ معمولی۔ یا مثلاً ارشد کی کتاب کہ اس سے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ ایک عام سی تحریر ہے۔ علمی نہیں صحافیانہ بحث کی متقاضی ہے اور اس سے متعلق آپ کی تحریر بھی ویسی ہی ہے، یعنی وہ بلند علمی سطح پر نہیں۔ ایسی تحریریں نہ ادب کے طلبہ کے کام آئیں گی اور نہ آپ کے وزن و وقار میں اضافے کا سبب بنیں گی۔

آپ مدلل مداحی کے بقول خود قائل نہیں، مگر اس مسودے میں کم از کم ایک طویل مضمون اشک کے ناول سے متعلق اسی ذیل میں آتا ہے۔ خاص کر لفظ "عظیم" کا استعمال، کہ یہ اس لفظ کے ساتھ انصاف کے منافی ہے۔

بہ ہر حال آپ چونکہ ان تحریروں کو چھپوانا ضروری اور مناسب سمجھتے ہیں، اس لیے میں کون ہوتا ہوں ٹوکنے والا اور روکنے والا۔ البتہ مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ اپنی رائے سے آپ کو واضح طور پر مطلع کر دوں۔ اگر آپ اپنے ایک نیاز مند اور قدر شناس کی رائے پر غور کرنا مناسب خیال کریں۔

یہ کتاب ضرور چھپے گی، اگر آپ نے اس کے خلاف فیصلہ نہ کیا۔ اگر آپ اب بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ ان تحریروں کو اسی طرح چھپنا چاہیے، تو پھر چھپنے دیجیے میں بھی تائید کرتا ہوں۔ مسودہ کل تک انجمن میں پہنچ جائے گا۔

آپ نے اپنے خط کی پیشانی پر ''ذاتی'' لکھ دیا تھا، میں بھی اس خط کو ''ذاتی'' قرار دے کر اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔ توقع کرتا ہوں کہ اس تحریر کو بھی ذاتی سمجھا جائے گا اور یہ عرض نیاز میرے اور آپ کے درمیان محدود رہے گی۔

میں بھی آپ کے ساتھ ہی ریٹائر ہوں گا، یعنی اکتوبر ۸۹ء میں۔ دہلی میں میں بھی نہیں رہوں گا، نئی کتابوں کا احوال پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی، خدا کرے یہ جلد تر چھپیں، کیونکہ ان میں سے ہر کتاب میرے خیال کے مطابق قابل قدر بھی ہوگی اور قابل ذکر بھی۔ یہی میرا جی چاہتا ہے کہ آیندہ آپ سے ایسی ہی کتابیں منسوب ہوتی رہیں اور باقی تحریروں کو آپ لکھ کر بھول جایا کریں۔

میں عرض کروں کہ ریڈیو پر ساٹھ ستر تقریریں تو میں نے کی ہی ہوں گی، بعض واقعی اچھے موضوعات پر تھیں، مگر کسی ایک کو بھی شامل کتاب کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہی احوال اکثر تبصروں اور مقدمات کا ہوا کرتا ہے، کاش آپ بھی اس پر عمل کرتے''۔

(''رشید حسن خاں کے خطوط'' جلد اول، مکتوب مرقومہ ۴؍نومبر ۱۹۸۸ء، ص ۸۴۔ ۷۸۲)

اس خط میں خاں صاحب نے آخر میں جو کچھ لکھا اس پر انہوں نے عمل بھی کیا۔ ان کے مضامین ۱۹۵۰ء سے قبل رسائل میں چھپنا شروع ہو گئے تھے۔ راقم نے ۲۰۱۴ء میں ان کے بکھرے ہوئے مضامین کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کی پہلی جلد بعنوان ''مقالات رشید حسن خاں'' ۲۲ مضامین پر مشتمل اور ۵۴۸ صفحات پر محیط ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں شامل مضامین مئی ۱۹۵۰ء تا اکتوبر ۱۹۶۰ء کے ہیں۔ دوسری تیسری اور چوتھی جلد بالترتیب ۲۵ مضامین و ۵۳۵ صفحات، ۳۵ مضامین و ۵۴۳ صفحات اور ۳۴ مضامین و ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہیں اور زیر طبع ہیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ جلد شائع ہو جائیں گی۔ راقم نے انہیں تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ خاں صاحب کے تدوینی کاموں کی سات، انتخابات چھپے۔ املا و عبارت سے متعلق چھ، قواعد و زبان اور فرہنگ سے متعلق ایک ایک کتاب شائع ہوئی۔

ان کے مقالات کی پانچویں جلد بھی کمپوز ہورہی ہے۔انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا زیادہ تر حصہ رسائل کی نذر کردیا اوراس کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں رکھا۔سبھی رسائل تک رسائی ناممکن ہے۔اگر خود انہوں نے ان مضامین، تبصروں اور مقدمات کو سنبھال کر رکھا ہوتا تو یہ کام کئی جلدوں پر مشتمل ہوتا۔

ان کی ادبی بے پروائی کا ایک اور ثبوت پیش کیا جارہا ہے۔اپنے ادبی و تدوینی کاموں کے سلسلے میں انہوں نے اندرون و بیرون ملک کے مشاہیر ادب و کتب خانوں کے نام کئی خط لکھے۔راقم نے ۱۵۶۴ خطوط جمع کر کے دو جلدوں بالترتیب ۱۰۵۵، اور ۶۵۶ صفحات پر محیط شائع کردیے ہیں۔ دوسو سے اوپر خطوط کی تیسری جلد بھی کمپوز ہورہی ہے۔اتنے ہی خطوط کے جواب بھی آئے ہوں گے۔مگر ان کی طبیعت کی خوبی دیکھیے کہ نمونے کے طور پر ایک خط بھی کسی ادبی شخصیت کا انہوں نے سنبھال کر نہیں رکھا۔کتنا بڑا ادبی نقصان ہوا ہے۔دوسروں نے ان کے خطوط کو سینے سے لگائے رکھا مگر انہوں نے سب تلف کردیے۔ان کے خطوط اور مضامین تحقیقی و تدوینی ادب کا علمی خزانہ ہیں۔

اپنے مضامین کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع نہ کرنے کی راقم کے نزدیک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو تدوینی کاموں میں اتنا مصروف کرلیا تھا کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا اس طرف سوچنے کا۔انہوں نے انہیں گزرے وقت کی داستاں سمجھ کر بھلادیا تھا۔

مذکورہ بالا خط کی پشت پر لکھتے ہوئے جبین صاحب کو ان کے چند مضامین کی ادبی اہمیت کا احساس کراتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مضمون اس کتاب میں شامل ہونے چاہئیں تاکہ اس کا ادبی مرتبہ بڑھ جائے۔مثلاً:

> ”ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے، اگر آپ بھی اس کو مناسب سمجھیں۔
> میرا خیال ہے کہ آپ اگر اپنے دوتین مقالے اس میں شامل کردیں اور دوتین ہلکے
> تبصروں کو نکال دیں، تو پھر یہ کتاب دوحصوں میں تقسیم ہوکر مفید تر ہوجائے گی۔مثلاً
> اسلوبیاتی تنقید سے متعلق آپ کا مضمون، وہ مضمون جو ارمغان فاروقی میں ہے اور
> آج کل میں سرور پر جو مضمون چھپا تھا۔یہ سب نہایت عمدہ مضامین ہیں۔یہ محض
> میری ذاتی رائے ہے، اس کا مان لینا قطعی لازم نہیں، آپ کی صواب دید پر منحصر ہے“۔

(ایضاً، ص ۸۵۔۸۴) (باقی)

سیر المنازل - ایک مطالعہ

ڈاکٹر علاء الدین خان

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ اور دلی کے آثار قدیمہ کا سب سے بڑا ماخذ فارسی کی وہ تاریخی کتابیں ہیں جو مختلف سلاطین و بادشاہ کے عہد میں لکھی گئیں، بارہویں صدی سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے آغاز تک تقریباً تمام تاریخیں فارسی میں لکھی گئیں، ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جن میں دلی کی عمارتوں اور یہاں کے آثار قدیمہ پر مواد موجود ہے، ان میں تاریخ مبارک شاہی، تاریخ فیروز شاہی، فتوحات فیروز شاہی، عجائب الاسفار، تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری، مآثر الامرا، سیر المتاخرین، خزائن الفتوح، منتخب التواریخ، اخبار الاخیار، عمل صالح، خلاصۃ التواریخ اور مفتاح التواریخ وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان کتابوں میں قطب الدین ایبک سے لے کر مغل بادشاہوں کے عہد تک دلی کی عمارتوں اور آثار کا ذکر ہے، جن سے ہمارے ملک کی تمدنی تاریخ وابستہ ہے، اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایک کتاب فارسی زبان میں ''سیر المنازل'' کے نام سے لکھی گئی، جس میں دہلی کی پرانی اور تاریخی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔

''سیر المنازل'' کے مولف مرزا سنگین بیگ ہیں، یہ کتاب ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی، اس میں مختلف حکمرانوں کے عہد میں دلی میں بسائے گئے شہروں، محلوں، عمارتوں، مسجدوں، مندروں اور مقبروں کا جغرافیہ، محل وقوع اور ان پر نصب شدہ کتبوں کی تفصیل ہے، دلی کے قلعوں، حویلیوں، دروازوں، گلی کوچوں، مکانوں، بازاروں، باغوں، دوکانوں، تھانوں اور پولیس چوکیوں کا حال بھی بیان کیا گیا ہے، دلی کے باشندوں، اہل حرفہ، صنعت کاروں اور اصحاب علم و کمال کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب سے قبل دہلی پر اس نوعیت کی علاحدہ سے کوئی مبسوط اور جامع کتاب ضبط تحریر میں نہیں لائی گئی البتہ اس کے بعد دو اہم کتابیں اردو زبان میں لکھی گئیں

☆ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

جن میں سے ایک سرسید احمد کی ''آثار الصنادید'' ہے اور دوسری مولوی بشیر الدین احمد کی ''واقعات دارالحکومت دہلی'' ہے، موخرالذکر تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ دہلی کی تہذیب اور یہاں کے قدیم وجدید تمدنی آثار کا مرقع ہے، اس میں مسلم عہد کی تعمیر شدہ عمارتوں اور مقابر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔

مرزا سنگین بیگ کی تالیف ''سیر المنازل'' سے متاثر ہوکر سرسید احمد خاں نے ۱۸۴۷ء میں اپنی اردو تالیف ''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن شائع کیا، اس میں شاہجہاں آباد اور اس کے باہر قدیم دہلی کی آبادیوں میں ان تاریخی عمارتوں کا احاطہ کیا ہے جن پر کتبات نصب تھے، ان کی نقل بھی آثار الصنادید میں شامل کی ہے، جہاں کتبات نہیں مل سکے ان کی تاریخ تعمیر لٹریری ماخذ یا روایت کی بنا پر متعین کی، ''آثار الصنادید'' میں عمارتوں کے علاوہ ابوالفضل کی آئین اکبری کے تتبع میں ایک علاحدہ باب دہلی کے دانشوروں، فن کاروں، علما اور فضلا وغیرہ پر لکھا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد یہاں کی تاریخ نویسی کے روایتی تصور میں اہم تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی، یہ تبدیلی تاریخ کے ماخذ میں آثار قدیمہ، سکہ جات اور قدیم عمارتوں کے کتبات کی شمولیت تھی، جن سے عمارت کی تعمیر سے متعلق عہد کا تعین، معماروں اور فن تعمیر کی عہد بعہد ترقی پر روشنی پڑتی ہے، اس تبدیلی کا آغاز مرزا سنگین بیگ کی تالیف ''سیر المنازل'' سے ہوا، یہ دہلی کے اعلیٰ انگریز افسر (ریزیڈنٹ) چارلس تھیوفلس مٹکاف کے ایما پر دہلی کی قدیم عمارتوں سے متعلق لکھی گئی تھیں، اس میں سنگین بیگ نے عمارتوں کے فارسی کتبات کو پڑھ کر شامل کیا اور اس طرح آثار قدیمہ کو عہد گذشتہ کی تاریخ کے ماخذ کے طور پر پہلی مرتبہ پیش کیا۔

''سیر المنازل'' کی ابتدا حمد ونعت سے ہوتی ہے، پھر مصنف نے تحریر کیا ہے کہ یہ کتبے شاہجہاں آباد کی ویران مساجد، مقابر اور عمارتوں کی تاریخ اور ان کے احوال سے متعلق ہیں، یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے دہلی کی عمارتوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ہر کتبے کو ہو بہو نقل کیا ہے اور ان میں سے بیشتر کے متعلق شمس الدولہ ذوالفقار الملک مرزا محمود خاں بہادر جنگ موسوی الحسینی سے تحقیقات کیں، (۱) تصنیف کی ابتدا اور تکمیل کا کوئی قطعی علم نہیں، پروفیسر شریف حسین قاسمی کا کہنا ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء سے قبل شروع ہوئی اور ۱۸۲۷ء تک مکمل ہو چکی تھی، (۲) سیر المنازل چونکہ انگریز افسر کے ایما پر لکھی گئی اس لیے مصنف کے قلم نے تعریف میں مبالغہ سے خوب کام لیا۔ لکھتے ہیں:

''ان صاحبِ عالیشان کے عدل نے مظلوموں کے خرابۂ دل کو آباد و معمور کیا، ان کے انصاف نے دنیا کو ظلم کے کانٹوں سے نجات دلائی، ان کی سخاوت کے برسنے والے ابر نے بے مایہ لوگوں کو سیراب کیا، ان کے بے پناہ احسان کے موتیوں نے ہوش و حواس کی سیپیوں کو بے نیاز کر دیا، ان کی بخشش و کرم کے خورشید نے کوئی ذرہ بے نور نہیں چھوڑا، یہ نرمی اور بردباری کا نمونہ ہیں، عدالت پرور ہیں، انصاف نواز ہیں''۔(۳)

اس مبالغہ آمیز تحقیق کے بعد اصل مضمون آتا ہے جس میں اولاً سلطان محمد غوری کے ہندوستان فتح کرنے سے پہلے کی دہلی نیز اس کے بعد کی دہلی کا مختصر ذکر ہے کہ قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں مملوک خاندان کی بنیاد ڈالی اور خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے نزدیک قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر کی اور قصر سفید نامی (۴) ایک محل تعمیر کرایا، لکھا کہ قطب مینار کی تکمیل التمش کے عہد میں ہوئی، ناصرالدین محمود نے ہزار ستون نامی عمارت تعمیر کرائی، یہ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں مکمل ہوئی، غیاث الدین بلبن نے بھی غیاث پور کے نام سے ایک شہر بسایا تھا، (۵) معزالدین کیقباد نے ۱۲۸۶ء میں کیلوکھڑی شہر آباد کیا اور جلال الدین نے کوشک لعل کی تعمیر کرائی، اسی طرح سیری کا قلعہ اور ایک شہر علاء الدین خلجی نے بنوایا، تغلق آباد کا شہر اور قلعہ غیاث الدین تغلق نے بنوایا، محمد بن تغلق نے شاہ پور نامی شہر، ایک محل اور بہت بلند ایوان تعمیر کرایا، اس میں سنگ مرمر کے ایک ہزار منقش ستون استعمال کیے گئے، اس کے علاوہ محمد بن تغلق نے بہت سی دوسری عمارتیں بھی تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ تغلق نے فیروز آباد شہر کی بنیاد رکھی، اس نے قصر جہاں نما کے نام سے ایک دوسرا محل بھی تعمیر کرایا جس میں جہاں نما مینار بھی ہے، اس نے ایک سرنگ بھی بنوائی تھی جس میں فیروز آباد سے جہاں نما تک سوار ہو کر آسکتے تھے، سید خضر خاں نے خضر آباد کا قلعہ بنوایا، اسی طرح مبارک شاہ اور دوسرے بادشاہوں کی تعمیر شدہ عمارتوں کا ذکر ہے۔

کتاب میں امیر تیمور کی ہندوستان آمد اور اس کے وزیر ملو اقبال خاں سے جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، ابراہیم لودھی اور بابر کی جنگ کا بیان بھی ہے جس میں بابر کی فتح کی تاریخ فتح بدولت لکھی ہے، ہمایوں اور شیر شاہ کے ذریعہ نو تعمیر عمارتوں اور پرانی عمارتوں کی مرمت کے بارے میں لکھا گیا کہ:

''ہمایوں نے ۱۵۴۱ء میں قلعہ اندرپت کو پھر سے تعمیر کرایا اور اس کا نام دین پناہ

رکھا، یہ قلعہ کہنہ کے نام سے بھی مشہور ہے، شیر شاہ نے سیری کو اجاڑ کر ایک دوسرا شہر تعمیر کرایا اور اس کا نام شیر منڈل رکھا، یہ شہر پرانے قلعے سے متصل تھا، شیر شاہ کے لڑکے سلیم شاہ نے قلعہ سلیم گڑھ کو دو سال کی مدت میں چار لاکھ روپئے کی لاگت سے مکمل کرایا''۔(۶)

مذکورہ شہروں اور عمارتوں کے جغرافیہ اور محل وقوع پر بھی سیر المنازل سے روشنی پڑتی ہے، شاہجہاں آباد کی عمارتوں، یہاں کے مقابر، مساجد، حویلیوں، دروازے، مکانات، مشاہیر علما، صنعت کار اور یہاں کی سماجی چہل پہل کے ساتھ شاہجہاں آباد کے قرب وجوار کی آبادیوں کا ذکر بھی ہے، گویا یہ شاہجہاں آباد کی مفصل تاریخ ہے۔

شاہجہاں آباد جس کو بالعموم دہلی کہا جاتا ہے، شاہجہاں نے آباد کرایا، اس کے کاریگروں میں سب سے بڑے استاد احمد حامد نامی تھے، سیر المنازل میں اس کی بنیاد اور تعمیر کی تاریخ ۱۶۳۹ء لکھی ہوئی ہے اور تکمیل کی تاریخ ۱۶۴۷ء درج ہے یعنی کل ۹ سال میں اس کی تکمیل ہوئی، اس پر کل خرچ ۵۹ لاکھ ۵ ہزار روپیہ آیا، اس خرچ کی تفصیل کتاب میں کچھ اس طرح درج ہے:

شاہ محل انجمن دیوان خاص	دو لاکھ روپیہ
باغ حیات بخش وحمام	چھ لاکھ روپیہ
نواب جہاں آرا بیگم ودیگر بیگمات کے محلات	سات لاکھ روپیہ
قلعہ کے اندر چوک، بادشاہی کارخانے ودیگر عمارات	چار لاکھ روپیہ
چہار دیواری وخندق	اکیس لاکھ روپیہ
کنواں اور باؤلی وغیرہ	پنچانوے ہزار روپیہ(۷)

مذکورہ تفصیل کے لیے کتاب میں کوئی حوالہ نہیں ہے، لیکن آگے اوپر ۵۹ لاکھ ۵ ہزار خرچ لکھا ہے، مذکورہ تفصیل سے کل جمع ۴۰ لاکھ پچاس ہزار ہی بنتا ہے، آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں نے پچاس لاکھ روپئے بتایا ہے، کل سولا کھ روپئے کے خرچے کا بھی ذکر ہے جس میں پچاس لاکھ قلعہ کے بنانے میں اور پچاس لاکھ قلعہ کے اندر مکانوں میں، (۸) آثار الصنادید میں تعمیر کی ابتدا کی تاریخ ۱۶۳۸ء اور تکمیل کی ۱۶۴۸ء درج ہے، (۹) قلعے کی لمبائی چوڑائی، دیواروں کی اونچائی، زمین کے نیچے

اس کی بنیادوں کی لمبائی چوڑائی اور زمین کے اوپر کا عرض اور پورے قلعہ کے رقبہ کی تفصیل بھی ہے، قلعہ کی لمبائی ہزار گز سیر المنازل اور آثار الصنادید دونوں میں یکساں ہے، لیکن عرض سیر المنازل کے مطابق ۳۰۰ گز اور آثار الصنادید کے مطابق چھ سو گز ہے، لیکن کل رقبہ دونوں کتابوں میں چھ لاکھ گز لکھا ہوا ہے، (۱۰) قلعہ کے مکانات، حویلی، مسجد، حیات بخش باغ (ساون بھادوں) وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے، اور یہ بھی کہ دیوان عام کے شمال میں ایک دروازہ ہے، اس کے باہر بادشاہ کا اصطبل اور خاصۂ کلاں وخرد ہے اور یہیں سے مہتاب باغ کی طرف جانے والا راستہ ہے، مہتاب باغ کے عقب میں بادشاہ سلامت کی رہائش ہے، دیوان عام کے مغرب میں ایک بڑا دروازہ ہے جسے نقار خانے کا دروازہ کہتے ہیں، اس کے اوپر ایک بلند عمارت ہے، یہاں تین وقت صبح شام اور آدھی رات کو نقارے بجائے جاتے ہیں، اتوار کے روز تمام دن نقارہ بجایا جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ یہ دن آفتاب سے منسوب ہے، بدھ کے روز بھی تمام دن نقارے بجائے جاتے ہیں اس لیے کہ یہ دن اکبر بادشاہ کے مبارک جلوس کا دن ہے، (۱۱) قلعے کے دہلی دروازے سے شہر پناہ کے اجمیری دروازے یعنی جنوب مغرب کی طرف سب سے پہلے قلعہ مبارک کے روبرو ایک چوک نواب سعد اللہ خان کے نام سے ہے، یہاں ہر سال غازی میاں اور مدار صاحب کی چھڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں، سعد اللہ خاں کا مختصر حال بھی ہے، شاہجہاں کے عہد میں سعد اللہ خاں کے منصب میں جو اضافہ ہوا اس کا بھی ذکر ہے، ۱۶۵۶ء میں اس کی موت اور مرض الموت کا بھی ذکر ہے، (۱۲) چوک سعد اللہ خاں کے ارد گرد کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

شاہجہاں آباد کی جامع مسجد کے بارے میں ہے کہ اس میں گیارہ دروازے باہر اور سات اندر کی جانب ہیں، اندر کی جانب محراب کی پیشانی پر جو بڑے در کے روبرو امام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے درج ذیل کتبہ خط ثلث میں کندہ ہے:

"لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط فِيْهِ رِجَالٌ
يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ
يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ" (۱۳)

مسجد کے گیارہ دروازوں پر کتبات کندہ ہیں۔

مسجد کے دونوں اندرونی اور بیرونی دالانوں میں سنگ مرمر کے مصلوں کی تعداد آٹھ سو اُنسٹھ ہے، بیرونی دروازوں پر جو عبارت لکھی ہوئی ہے وہ خط نسخ میں ہے، مسجد کے تین طرف سیڑھیوں کی تعداد کا بھی ذکر ہے، جانب مشرق ۳۵، شمال کی طرف ۳۹ اور جنوب کی طرف ۳۳، ان تینوں سمت کی سیڑھیوں پر مصنف کے عہد میں ہونے والے کاموں کا بھی ذکر ہے، مشرقی سیڑھیوں پر روزانہ تیسرے پہر کبوتر اور ہر قسم کے جانور ہر موسم میں شوقینوں اور بچوں کے لیے فروخت ہوا کرتے تھے، شمالی سیڑھیوں کے نیچے شام کے وقت ایک داستان گو قصے سناتا تھا، جنوبی سیڑھیوں پر تیسرے پہر کتابیں، ہتھیار اور ہر قسم کی اشیا بکتی تھیں۔(۱۴)

مصنف نے لال قلعہ اور جامع مسجد کو مرکز بنا کر شاہجہاں آباد کی گلیوں، کوچوں، محلوں، بازاروں اور باغات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، انیسویں صدی کے ابتدائی عہد کی دلی کے مکانات، ان کے مکینوں، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں، ان کی دوکانوں، دہلی کے تھانوں، پولیس چوکیوں وغیرہ کا ذکر سیر المنازل سے قبل لکھی گئی کتابوں میں نہیں ملتا، کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے دہلی کی سماجی تاریخ کے بعض دلچسپ پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

سیر المنازل میں لال قلعہ اور اس کی عمارات کا ذکر آج کے مورخین کے لیے اس وجہ سے اہم ہے کہ اب ان میں سے بعض عمارات منہدم ہوچکی ہیں، قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک جنوبی بازار کی تفصیل میں دونوں طرف صرافوں کی دوکانوں اور شرف الدولہ کی مسجد اور ان کے مدرسے کا ذکر ہے۔

سیر المنازل کے کتبات اس لیے بہت اہم ہیں کہ یہ پہلی مرتبہ نقل ہوئے ہیں، جیسے محمد شاہ تغلق کے وزیر اعظم خان جہاں تلنگی کے مزار کا کتبہ، یہ کتبہ چند قرآنی آیات اور ایک تاریخی قطعے پر مشتمل ہے، آثار الصنادید اور واقعات دار الحکومت دہلی میں اس کتبے کا ذکر نہیں ہے۔

آثار الصنادید کے مقابلے میں سیر المنازل اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب (غدر) سے پہلے کی دہلی کے گلی کوچے، اہل حرفہ اور عام وخاص کا ذکر ملتا ہے۔

سیر المنازل دہلی کی سماجی، تہذیبی وتمدنی تاریخ پر مشتمل ہے اس لیے اس میں اہم اشخاص و

مقامات، چاندنی چوک، چوک خاص اور چوک نواب سعد اللہ خاں کے علاوہ بازار، دریبہ منڈی، چھتہ، کٹرہ، کوچہ، محلہ، گلی، پھاٹک، کھڑکی، کوٹھی وغیرہ کا ذکر ہے، ان کی تفصیل طوالت طلب ہے، البتہ ذیل میں دی گئی فہرست سے مصنف کی محنت کا انداہ کیا جاسکتا ہے:

حویلی: ۱۱۲۔ جس میں حویلی اعظم خان، حویلی بخشی بھوانی شنکر، حویلی خواجہ قطب الدین کاکی، حویلی شاہزادہ داراشکوہ، حویلی نواب شمس الدولہ، حویلی مہابت خان، حویلی نواب سیف اللہ خان وغیرہ۔

حوض، دریا، نہر، کنواں: ۲۷۔ نہر سعادت خان، حوض قاضی، حوض خاص، چاہ سبز، چاہ شور، دریائے گنگ وجمن۔

بنگلہ: ۸۔ بنگلہ جہانگیر شاہ (نیلی چھتری)، لال بنگلہ۔

بالا خانے: ۴۔ بالا خانہ نواب فتح اللہ بیگ۔

منازل ومکان: ۸۔ سرائے: ۱۷۔ باغ وباغیچہ: ۴۱۔ محلات: ۲۰۔

لاٹ: ۴۔ جس میں لاٹ سنگ خارا، لاٹ فیروزشاہ، لاٹ قطب صاحب، منارۂ جہاں نما

قلعہ: ۱۲۔ سیری، دین پناہ، قلعہ اکبرآباد، قلعہ اندرپت، قلعہ رائے پتھورا، قلعہ تغلق آباد، قلعہ سلیم گڈھ، قلعہ کہنہ (دین پناہ)، قلعہ مبارک (لال قلعہ)، مرزغن، نور گڈھ۔

مدارس: ۷۔ دارالبقا، مدرسہ ماہم بیگم، مدرسہ مولانا شاہ عبدالعزیز، مدرسہ مولوی فخرالدین، مدرسہ نواب روشن الدولہ، مدرسہ نواب شرف الدولہ، مدرسہ نواب غازی الدین۔

مساجد: ۷۵۔ زینت المساجد، مسجد اکبرآبادی (اب موجود نہیں)، مسجد عبدالنبی، مسجد قوت الاسلام، مسجد کھڑکی، مسجد موٹھ، فخرالمساجد، موتی مسجد وغیرہ۔

منادر: ۵۔ مندر پارس ناتھ، مندر جوگ مایاجی، مندر کالکاجی وغیرہ۔

قبرستان: اس میں قبرستان درگاہ حضرت شمس العارفین ترکمان بیابانی، قبرستان شاہ ولی اللہ، قبرستان صاحبان انگریز، قبرستان کمبل پوش، قبرستان مسلمانان وغیرہ کا ذکر ہے۔

پل: ۴ عدد۔ گھاٹ: ۳۔ اس میں راج گھاٹ کا ذکر ہے۔

پنجہ وامام باڑہ: ۳۔ جس میں پنجہ امام حسین، پنجہ حضرت شاہ مردان، امام باڑہ میر عسکری۔

قدم ومکان آثار، ڈاک خانہ، ہسپتال، ٹکسال، چھاؤنی، بارک، توپ خانہ، تھانہ، چوکی، جیل

خانہ، کچہری وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

چند تاریخی قطعات بھی ہیں، جو الواح قبور یا عمارتوں سے متعلق ہیں، سیر المنازل میں آثار الصنا دید سے زیادہ کتبات ہیں، البتہ آثار الصنا دید کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ سر سید نے ہر عمارت کا نقشہ بنایا ہے جس سے ان عمارتوں کے فن تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حوالہ وحواشی

(۱) مرزا سنگین بیگ، سیر المنازل، فارسی متن مع اردو ترجمہ، مرتب: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۳-۱۴۱ شمس الدولہ ذوالفقار الملک ایران کے رہنے والے تھے اور محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی کی خدمت میں بخشی کے عہدے پر فائز تھے، بخشی کو ایران میں عارض کہا جاتا تھا۔ (۲) ایضاً، پیش لفظ، ص: ب، ج۔ (۳) ایضاً، ص ۴۴-۱۴۳۔ (۴) رائے پتھورا کے قلعے میں قصر سفید نامی محل تھا جہاں قطب الدین ایبک رہا کرتا تھا۔ (۵) غیاث پورہ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس تھا۔ (۶) سیر المنازل، حوالہ مذکورہ، ص ۱۵۰۔ (۷) ایضاً، ص ۱۵۱۔ (۸) سید احمد خان، آثار الصنا دید جلد اول، مرتبہ: خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۸۔ (۹) ایضاً، ص ۲۴۸۔ (۱۰) سیر المنازل، ص ۱۵۱، آثار الصنا دید، ص ۲۴۸۔ (۱۱) سیر المنازل، ص ۱۵۴۔ (۱۲) ایضاً، ص ۱۵۵۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۵۷۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۶۱۔

”غبار خاطر“ کا اسلوبیاتی تناظر

ڈاکٹر قسیم اختر

مولانا ابوالکلام کی نثر کی پہلی خصوصیت ان کا پرشکوہ اسلوب ہے۔ان کے اسلوب میں علم کی گہرائی کا احساس بسا ہے تو ان کی علمی انانیت کا پس منظر بھی۔کیوں کہ تشکیلِ اسلوب کا معاملہ انسان کی داخلیت سے بھی جڑا ہوتا ہے۔اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لفظی انتخاب کا معاملہ نفسیاتی معاملات سے بھی متعلق ہوتا ہے۔حالاں کہ بہت سے اسلوبیاتی ناقدین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلوب کا مطالعہ دراصل معروضی ہوتا ہے۔تاہم یہ بات بھی اہم ہوسکتی ہے کہ اسلوبیات، لسانیات سے حددرجہ قریب ہونے کے باوجود لسانیاتی سروکار سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔کیوں کہ لسانیات میں الفاظ کے استعمال اور صوتی آہنگ سے زیادہ رابطہ رکھا جاتا ہے تاہم اسلوبیات میں معنیاتی نظام کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے۔ظاہر ہے جب معنیاتی نظام کو زیر بحث لایا جائے گا تو از خود اسلوب کی معروضیت میں لچک پیدا ہوگی۔اسلوب کے تناظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ”ادبی تنقید اور اسلوبیات“ میں لکھا ہے ”صوتیات، لفظیات، نحویات اور معنیات“ کا تعلق اسلوبیاتی تجزیے سے ہے۔

یہ بحث بجائے خود نارنگی اسلوب کا تعین کرتی ہے، یہاں اس کی تفصیل بلکہ وضاحت کی بھی ضرورت نہیں، اس لیے مولانا آزاد کے شاہکار غبار خاطر کے مطالعہ میں صرف ادبی اسلوب کے اصولوں ہی کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام کے نثری اسلوب میں ان کی زندگی اور خاندانی پس منظر کا بڑا عمل دخل ہے اور ان کے خطیبانہ آہنگ کا بھی۔اسی طرح کم عمری میں انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اس سے بھی کسی خود اعتمادی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی ہی شخصیت کا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ڈی ایس کالج، کٹیہار-۸۵۴۱۰۵، موبائل: ۹۴۷۰۱۲۰۱۱۶۔

نام ہے جو آج بھی کسی نہ کسی درجہ بے توجہی کے باوجود زندہ ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد وہ دیدہ ور تھے جو نرگس کے ہزاروں سال آنسو بہانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ صرف چودہ سال کی عمر میں مشرقی علوم کا نصاب مکمل کر لینا اور پندرہ سال کی عمر میں ماہنامہ جاری کرنا ان کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ ایک جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی، اصول پسند سیاست داں، قوم وملت کے ہمدرد رہنما اور مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی طرز کے منفرد انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" ان کے اسلوب کا نادر تحفہ ہے۔ قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران مولانا آزاد نے یہ خطوط لکھے تھے۔ حالانکہ یہ اسیری بڑی سخت تھی، کسی سے ملنے اور خط وکتابت پر بھی پابندی تھی، مولانا کسی سے مراسلت نہیں کر سکتے تھے مگر دل کا غبار نکالنے کے لیے قلم وقرطاس تو تھے ہی۔ یہ "غبار" جب یکجا ہو گیا تو "غبار خاطر" کی صورت میں وہ خطوط سامنے آئے اور ہر قاری کے ذہن پر چھا گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کی مذکورہ خصوصیات کا سرا اگر ان کے اسلوب سے جوڑیں تو از خود واضح ہوگا کہ ان کے اندر خودداری اور خود اعتمادی کا جوہر تھا۔ دانشورانہ روایت اور خاندانی وجاہت کے ساتھ ان کے اندر صحافیانہ مزاج تھا۔ ظاہر ہے جب یہ تمام خصوصیات مدغم ہو کر ایک انسان کا اسلوب ٹھہرے تو اس کے پر شکوہ ہونے میں کوئی شک نہیں، اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ کسی صاحب قلم کے اسلوب میں موضوعات ومواد کی وجہ سے معمولی تبدیلی فطری طور پر ممکن ہے اور یہی عنصر صاحب قلم کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ہر جگہ ان کے اسلوب کے مختلف رنگ ہیں۔

الہلال اور البلاغ کے اداریے دیکھیں ان کا الگ ہی انداز ہے، "تذکرہ" کے لیے جو اسلوب اختیار کیا جانا چاہیے مولانا آزاد وہاں وہی اسلوب اپناتے ہیں۔ اسی طرح غبار خاطر میں کوئی ایک اسلوب نہیں ملتا بلکہ مکتوبات کے موضوعات جدا جدا ہونے کی بنا پر طرز نگارش بھی جدا جدا اختیار کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں آسان اور عام فہم نثر سے سامنا ہوتا ہے تو کہیں شاعرانہ چاشنی کچھ اور ہی لطف دے جاتی ہے اور کہیں فارسی آمیز علمی زبان قاری کی فہم ولیاقت کا امتحان لیتی نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کی اسی طرز نگارش کا ذکر کرتے ہوئے عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

''ان میں کبھی وہ انشائیہ نگار بن جاتے ہیں، کبھی کہانی کار، کبھی مورخ، کبھی فلسفی، کبھی محقق، کبھی ناقد، کبھی موسیقی نواز، کبھی انسانیت کے علمبردار اور کبھی محض ایک خط نگار، یہ سارے خطوط غبار خاطر میں جمع ہیں اور اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں۔''(۲)

عبدالقوی دسنوی کی ان باتوں سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ انشائیہ دراصل زبان کی ترنگ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لفظوں کے انتخاب میں جہاں صوتی آہنگ سے سروکار رکھا، وہیں انھوں نے تشکیل زبان میں ترنگ کو بھی سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غبارِ خاطر کی قرأت کے دوران ہم زیرلب مسکرا بھی دیتے ہیں، یہی وہ خصوصیت ہے کہ ان کے اسلوب کو انشائیہ سے جوڑا جاتا ہے، جس طرح کہانی کے لیے بیانیہ ایک لازمی عنصر ہے اور بیانیہ اس وقت دلچسپ ہوتا ہے جب پلاٹنگ کا خیال رکھا جائے۔ ''چڑیا چڑے'' میں بھی بیانیہ اور واقعات کے معروضی ارتباط کا طریقہ موجود ہے۔ اس لیے ''غبار خاطر'' میں کبھی بیان کنندہ ابوالکلام نظر آتے ہیں۔ تو وہ مورخ بھی نظر آتے ہیں، وہ بھی صرف ایسے مورخ نہیں جو فقط اپنے زمانے کی تاریخ بیان کررہا ہو، بلکہ اپنے سے ماقبل تاریخ کا تجزیہ نگار بھی۔ تاریخی تجزیہ نہ صرف ابوالکلام آزاد کی علمیت کا ثبوت ہے بلکہ ان کی یادداشت پر عش عش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ رہی بات موسیقی کی تو اس کے متعلق طویل ترین مضمون اس میں موجود ہے۔ یہ مضمون جہاں ان کی علمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہیں اسلام اور موسیقی کے متعلق آگاہی اور علمی استحضار کی دلیل فراہم کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسی اسلوب کی تحسین کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی نے اپنے منفرد لب ولہجہ میں کہا کہ:

''خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیب اور نئی تشبیہیں اور نئے اسلوب ہر ہفتے اسی ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی وشبلی کی سلاست، سادگی سرپیٹتی رہی اور اکبرالہ آبادی اور عبدالحق سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے۔''(۳)

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب فقط بھاری بھرکم الفاظ ہی سے تشکیل نہیں پاتا ہے بلکہ نئی نئی ترکیبیں اور تشبیہیں ان کی نثر کو تازگی عطا کرتی ہیں۔ شاعری میں تراکیب کی اپنی اہمیت

تومسلم ہے لیکن نثر میں یہ کیا کمال دکھاتی ہیں اس کے نظارہ کے لیے غبار خاطر بہترین نمونہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر کے کئی خطوط میں عام فہم زبان استعمال کی ہے۔بعض علامتی کہانیوں میں بھی ان کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔

دوسری طرف جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا شاعرانہ انداز بیان بھی اختیار کیا گیا ہے، یہ انداز غبار خاطر کا وصف خاص ہے۔اس انداز بیان کے ساتھ اشعار کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے لیکن مولانا آزاد کو پورے طور پر سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔کیوں کہ اس میں عربی کے اشعار کے ساتھ ایسے نامانوس الفاظ اور ترکیبات کا استعمال بھی ملتا ہے جنہیں عربی زبان سے پوری واقفیت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔مولانا نے عربی فقرے، ضرب الامثال اور ترکیبوں کو تو اپنایا ہی ساتھ ہی فارسی تراکیب اور الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔غبار خاطر کا آغاز ہی فارسی کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کے ان مکتوبات میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے جو زبان کی مشکل پسندی کے باوجود ان کی تحریر کو دلچسپ اور دل نواز بناتی ہے۔ان تحریروں میں مولانا آزاد کی شخصیت بھی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔سب سے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ قید و بند کی صعوبت میں بھی مولانا کی رومان پسندی نہیں جاتی۔وہ اس انداز سے شرح دل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے نہایت خوشگوار ماحول میں قلم کاغذ لیے بیٹھے ہوں۔اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز یادوں کے تہہ خانے کا در وا کر کے ہیرے جواہرات لٹا لٹا کر خوش ہو رہے ہوں۔ان کے اسلوب کی یہی دلکشی ہے کہ حامدی کاشمیری ان خطوط کو خطوط نہیں انشائیہ قرار دیتے ہیں۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''غور سے دیکھا جائے تو ''غبار خاطر'' کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالت اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپرد قرطاس کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقاید، افکار اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے، چنانچہ ''غبار خاطر'' میں مذہب، خدا، کائنات اور غم و مسرت جیسے گمبھیر مسائل سے لے کر حریفان سقف و بام یعنی چڑیوں سے محاذ آرائی جیسے مزاحیہ واقعے کے بیان تک مصنف نے پوری ذہنی

آزادی اور طبیعت کی ترنگ کے مطابق اپنے خیالات وتاثرات کو قلم بند کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگارشات انشائیہ نگاری ہی کے ذیل میں آتی ہیں......"(۴)

اب تک "غبار خاطر" سے کوئی اقتباس درج کرنے سے گریز کیا گیا لیکن اس کے بغیر ان کے اسلوب پر گفتگو نامکمل ہوگی۔ چند خطوط سے منتخب یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں جو ان کے الگ الگ انداز بیان کو واضح کرتے ہیں:

اقتباس نمبرا۔ "موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصہ سے آرہی تھی۔ جب وہ دانوں پر چونچ مارتی تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رخ کرتی وہاں اس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہوجاتا، ایک دو سکنڈ بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی۔"(۵)

اقتباس نمبر۲۔ "......اصحاف کہف کی نسبت کہا گیا ہے۔ فَضَرَبْنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہوگئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے وہ دنیا ہی نہ رہی:

كَانَ لَمْ يَكُن بَينَ الْحَجُون إِلَى الصَّفَا أَنِيسٌ وَلَمْ يَسْمَرْ بِمَكَّةَ سَامِرٌ!

اقتباس نمبر۳۔

"ایں رسم و راہ تازۂ حرمان عہد ماست عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

صدیق مکرم!

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے، چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے اور طبیعت درازنفسی کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد وشیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں، میرے ذوق مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے:

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما

ان تین اقتباسات میں تین طرح کے اسلوب ہمارے سامنے ہیں۔ ایک بالکل عام فہم، دوسرا عربی شعر اور عبارت سے مملو اور تیسرا فارسی آمیز۔ ایک چوتھا اسلوب بھی ہے۔ اور یہ اس قدر دلکش

ہے کہ سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہوجاتی ہیں،تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں،اسیران قید ومحن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔صبح جب طبا شیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی،تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا،قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انہیں دیکھ لیا کریں گی۔فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے،کسی کو محروم کرے،وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے،تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔''(۵)

مولانا کا یہ اسلوب ان ہی کے لیے مخصوص تھا۔الہلال کی اشاعت کے دوران دوسرے لکھنے والوں کی بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ ابوالکلام جیسی نثر لکھیں مگر اصل اور نقل کا فرق واضح ہے۔اوپر دیے گئے یہ اقتباسات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مولانا آزاد کے اسلوب کو کسی ایک طرز اظہار کا نام دے کر محدود نہیں کیا جاسکتا۔عبدالقوی دسنوی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں انشائیہ نگار بھی ہیں،محقق بھی،فلسفی اور مورخ بھی،ناقد اور موسیقی نواز بھی۔کم لفظوں میں کہیے تو ابوالکلام آزاد نے موئے قلم سے جو نقش ونگار بنائے ہیں وہ ہر نظر کو حیرت اور روح کو تازگی عطا کرتے ہیں۔''غبار خاطر'' کی دلکشی اس کی حیات آفریں طرز تحریر ہے۔اسی دلکشی کے قربان جاتے ہوئے نیاز فتح پوری نے مولانا آزاد کو ایک خط میں لکھا تھا''اگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں بھی دے تو ہل من مزید کہتا رہوں گا۔'' اور حسرت موہانی نے اپنی حسرت کا اظہار اس طرح کیا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

''غبار خاطر'' سے یہ سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ کیا خطوط کی بے ساختگی اس میں باقی ہے یا فقط تصنع ہی تصنع ہے۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے''خط دلی جذبات وخیالات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔'' آل احمد سرور نے لکھا ہے۔''اچھا خط وہ کہا جاسکتا ہے کہ جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب

سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک ہو''۔(۶)

ان معزز ناقدین کی رائے اپنی جگہ اہم ہے، مگر پہلی بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام نے ''غبار خاطر'' میں کتنے لوگوں کو مکتوب الیہ بنایا؟ دوسری بات یہ ہے کہ کیا واقعی ان خطوط کے تبادلے ہوئے؟ تیسری بات یہ کہ ان خطوط کو لکھتے وقت مولانا ابوالکلام آزاد نے کتابوں سے استفادہ کیا؟ چوتھی بات یہ کہ قید و بند کی زندگی میں کتنی رنگا رنگی ہو سکتی ہے کہ ہر خط میں ذاتی احوال ہوں؟

ان چار سوالوں میں سے دو باتیں انتہائی اہم ہیں۔ مکتوب الیہ کے تناظر میں، دوم کتابوں کے استفادے کے معاملے میں۔ مکتوب الیہ کے تناظر میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کا نام ہے۔ ظاہر ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے جن مباحث کو خطوط میں پیش کیا وہ ان دونوں کے درمیان بے تکلفی کی حیثیت رکھتے ہوں، ایسی بحث کو ایک سادہ بحث مانتے ہوں، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے علمیت کے اظہار کے لیے خط لکھتے وقت کسی کتاب سے استفادہ نہیں کیا۔ گویا علمی مباحث ان کی بے تکلفی کے زمرے میں آتے ہیں۔ پھر جیل کی زندگی میں کوئی رنگا رنگی نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیل کی زندگی کے مناظر بیان کرتے تھے اور اسی تناظر میں علمی گفتگو کرتے تھے۔

ترکیب، تشبیہ، صوتی آہنگ اور فکری ارتباط سے ایک شعری ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ ابوالکلام کی نثر میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر کو لوگوں نے شاعری اور پر تکلف زبان سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا آزاد کے اس اسلوب کے پر شکوہ انداز کی دراصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایک متضاد و متنوع شخصیت کے حامل تھے۔ ظاہر ہے جس انسان کے اندر متضاد صلاحیتوں اور خصوصیتوں کا انضمام ہو وہ نہ صرف اپنی فکر سے ہمیں متاثر کرے گا بلکہ اس کے اظہار کے رویے بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کریں گے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے لکھا ہے:

> ''خطبات کے اسلوب کی سادگی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اسلوب آزاد کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں، بلکہ زبان کے فوری اور برجستہ استعمال کے نتیجے میں معرض

وجود میں آیا ہے۔"(۷)

مولانا آزاد کے اسلوب میں برجستہ پن کی ایسی شان ہے کہ اس کی تفہیم ہر ایک کے لیے آسان نہیں، اسلوب جب علم سے گہرا اور تہہ دار ہو جائے تو اس کو سمجھنے کے لیے استعاروں اور کنایوں کو سمجھنا ہوگا۔ اس لیے محض یہ کہنا کہ ان کے اسلوب میں ثقالت ہے، کوئی مناسب و معقول بات نہیں۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں یہ مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ معروضیت کے باوجود اسلوب کے مطالعے میں یک گونہ لچک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر خلیل احمد بیگ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے جس طرح ان کے اسلوب کا مطالعہ کیا ہے اس سے بھی اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اسلوب کی تشکیل میں خاندانی پس منظر اور انسان کی داخلیت کا معاملہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلوب یا لفظی انتخاب کے معاملے میں اگر مولانا آزاد شعوری کوشش نہیں کرتے تھے تو گویا لاشعوری معاملات کا ان کے یہاں عمل دخل ہوتا تھا۔ وہ بغیر تامل کے ایسے الفاظ اور استعارے استعمال میں لاتے جو بہت سے اہل قلم سوچنے کے باوجود استعمال میں نہیں لا سکتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا پڑے گا کہ اسلوب کی تشکیل دراصل لاشعور سے بھی جڑی ہوتی ہے۔ مولانا کے لاشعوری نظام میں ایسے بھاری بھر کم الفاظ پیوست تھے جنھیں وہ بے تکلف و کوشش استعمال میں لے آتے تھے۔

حواشی

(۱) گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۔ (۲) عبدالقوی دسنوی، ابوالکلام آزاد (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۷۷-۷۸۔ (۳) ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت (مرتبہ رشید الدین خاں) بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ وہاب اشرفی۔ (۴) مولانا آزاد کی ادبی شخصیت (غبار خاطر کے آئینے میں) ایوان اردو، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ص ۱۶۹۔ (۵) ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۶۹۔ (۶) ملک زادہ منظور احمد، غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ، لاٹوش روڈ لکھنؤ، ص ۵۵۔ (۷) مرزا خلیل احمد بیگ، اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے، این سی پی یو ایل دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۶۔

اخبار علمیہ

''دو ہزار سال قدیم بائبل کی دریافت''

اسرائیل میں ماہرین آثار قدیمہ کو بائبل کے دو ہزار برس پرانے مخطوطہ نسخے کی باقیات ملی ہیں جس کے متعلق کہا جارہا ہے کہ یہ ''بحیرۂ مردار کے مخطوطات'' کی دریافت کے بعد سے آج تک کی اہم ترین دریافت ہے۔ صحرائے یہودا جنوبی اسرائیل سے لے کر مغربی کنارہ کے مقبوضہ فلسطینی علاقہ تک پھیلا ہوا ہے تاہم دیگر ذرائع سے ابھی اس کی تحقیق نہیں ہو پائی ہے۔ رپورٹ کے مطابق رول کی شکل میں بائبل کے یہ باقیات اس علاقہ میں کھدائی کے دوران ایسی جگہ ملیں جو Cave of Horrors کہا جاتا ہے۔ یہ باقیات عبرانی زبان کی بائبل کے یونانی ترجمے کی ہیں جو ۱۹۶۰ء کی دہائی سے اب تک کی اپنی نوعیت کی اہم ترین دریافت ہے۔ ٹوکری میں رکھے ہوئے ان باقیات کے ساتھ ہزاروں سال پرانے بہت سے قیمتی سکے بھی موجود تھے۔ (منصف حیدرآباد، ص ۵، ۱۷/ مارچ ۲۱ء)

''لفظ ''اللہ'' کے استعمال کی اجازت کا مسئلہ''

ملائیشیا میں لفظ ''اللہ'' کے استعمال پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک عرصہ سے اختلاف رہا ہے۔ مسیحیوں کو شکایت ہے کہ دوسروں کے لیے لفظ ''اللہ'' کے استعمال کی ممانعت ملک میں بڑھتی ہوئی مسلم قدامت پسندی کی آئینہ دار ہے لیکن مسلمانوں کا کہنا ہے کہ مسیحی اپنے لٹریچر یا مذہبی مواد میں لفظ اللہ کے استعمال میں حد سے متجاوز اور غیر محتاط ہیں۔ اس کے علاوہ اس معاملہ میں متعدد مرتبہ ملائیشیا میں تشدد بھی ہو چکا ہے اور دونوں قوموں میں مستقل کشیدگی پائی جاتی ہے۔ کچھ دنوں قبل کوالالمپور ہائی کورٹ نے مسیحیوں کو اپنے شائع شدہ مواد میں اللہ کے استعمال کی اجازت کا فیصلہ دیا اور ۱۹۸۶ء میں غیر مسلموں کو اس کے استعمال پر عائد پابندی ختم کر دی اور کہا کہ ملائیشیا کا دستور مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے، تاہم حکومت کی جانب سے اس عدالتی فیصلہ کو چیلنج کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ وہ اس فیصلہ سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے کہ غیر مسلموں کی جانب سے اس لفظ کا استعمال غیر واضح اور مبہم صورت پیدا کرتا ہے۔ رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ تیرہ برس قبل یہ مقدمہ اس وقت عدالت کے سامنے آیا تھا جب کوالالمپور کے ایک مطار پر ایک مسیحی خاتون کے پاس مالے زبان میں شائع شدہ

ایسا مذہبی مواد ملا تھا جس میں لفظ اللہ کا استعمال بھی شامل تھا۔اس کے بعد ایک مذہبی جماعت کے رکن جل آئرلینڈ لاوٴرنس بل نے اس پابندی کے خلاف عدالت سے رجوع کیا تھا۔ ۲۰۱۴ء میں ایک چرچ سے بائبل کی ایسی کاپیاں برآمد کی گئی تھیں جن میں خدا کے لیے لفظ ''اللہ'' تحریر تھا۔اس کے بعد چرچ پر پٹرول بم سے حملہ ہوا تھا۔اس اجازت سے ممکن ہے پھر غیر یقینی صورت حال پیدا ہوجائے، اس لیے عدالت کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔واضح رہے کہ ملائیشیا کی تیس ملین آبادی میں مسیحی شہریوں کی تعداد دس فیصد سے بھی کم ہے اور یہ سب نسلی لحاظ سے یا تو چینی یا ہندوستانی یا پھر قدیم باشندے ہیں۔مسلمان یہاں ساٹھ فیصد ہیں جن کی اکثریت مالے نسل کے مسلمانوں کی ہے۔

(اردو ٹائمز،ممبئی،ص ۵، ۲۱/۳/۱۷ء)

''تدریسی پروگرام۔ایڈ بورڈ''

''ایڈ بورڈ'' ایک طرح کا تدریسی ہارڈ ویر پروگرام ہے جس میں بچے حقیقی انجینئر اور سائنس دانوں کی طرح پہلے کتاب سے سائنسی نظریات اور تصورات ایک کہانی کی صورت میں پڑھتے ہیں، اس کے بعد وہ کھیل کھیل میں مقناطیسی سرکٹ بورڈ پر دلچسپ اشیا بناتے ہیں۔انڈی گوگو کراوٴڈ فنڈنگ ویب سائٹ پر موجود انقلابی تدریسی پروگرام اگلی نسل کے لیے خاص تحفہ ہے۔ پہلے کتاب میں سائنس، ریاضی، انجینئرنگ اور دیگر علوم کے تصورات ایک کتاب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اس کے عملی اطلاق کے لیے ایسے سرکٹ بورڈ بنائے گئے ہیں جو حسب سہولت تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔پروگرام میں بہت ساری سرکٹ اور اس کے ساتھ رہنما کتاب اور اسباق موجود ہیں اور ہر سبق بچوں کو نئی بات سکھا کر ان کے اندر ایک نیا اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ہر سرکٹ ایک کہانی کو پورا کرتا ہے۔اسی طرح بچے بہت دلچسپ اور تفریحی انداز میں سائنس اور انجینئرنگ کے کئی اہم اسباق سیکھ اور سمجھ لیتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ایڈ بورڈ ان افراد کے لیے ہے جنھوں نے کبھی برقی سرکٹ پر کام نہیں کیا ہے وہ بھی پر اعتماد طریقے سے اسے استعمال کر سکتے ہیں۔اس پروگرام کو متعارف کرانے سے پہلے بچوں کی صلاحیت اور ان کی قوت اخذ وکسب پر بہت وسیع تحقیق کی گئی ہے۔

(اخبار مشرق،کلکتہ،ص ٦، ۲۱/۳/۱٦ء)

''سعودی طالبہ کی منفرد ایجاد''

سعودی عرب میں کالج آف ہیلتھ سائنسز کی طالبہ امل البلوی نے طبی اصطلاح میں ''نینو بلڈ بیگز'' کے نام سے ایک نئی ٹیکنک ایجاد کی ہے۔امل نے اپنی ایجاد کی اجارہ داری کے حوالہ سے بین الاقوامی پیشکش مسترد کر دیا ہے۔انھوں نے سعودی وزارت صحت کے ساتھ ایک سمجھوتہ پر دستخط کیے ہیں تا کہ اس ٹکنالوجی کے ایجاد کا سہرا مملکت کے سر بندھ جائے۔امل کے بیان کے مطابق یہ ایجاد ایک ٹیکنالوجیکل سروس ہے جو کاربن اور سلیکون کے ذرات پر مشتمل مادہ داخل کرنے کے خیال پر مبنی ہے۔ یہ مادہ خون میں وائرس کے انکشاف کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کی ایسی طبعیاتی خصوصیات ہیں جو وائرس کی جانکاری حاصل کرنے میں کامیاب کرتی ہیں،خواہ خون میں وائرس کا ارتکاز کم ہی کیوں نہ ہو۔

(راشٹریہ سہارا لکھنؤ،۲۱/ ۲/ ۲۱ء،ص ۱۲)

''دنیا کے ۳۰ آلودہ شہر''

ایک خبر کے مطابق دنیا کے ۳۰ آلودہ شہروں میں سے ۲۲ ہندوستان میں ہیں۔دہلی دنیا میں سب سے زیادہ آلودہ دارالحکومت قرار پایا ہے۔سوئٹزرلینڈ کی ایک تنظیم آئی کیوایئر نے یہ رپورٹ تیار کی ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دہلی کی ہوا کا معیار ۲۰۱۹ء کے مقابلہ ۲۰۲۰ء میں بہتر ہوا ہے۔ دہلی کے علاوہ ۲۱ دوسرے آلودہ شہر غازی آباد، بلند شہر، سیراک جلال پور، نوئیڈا، گریٹر نوئیڈا، کانپور، لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ، مظفرنگر (یوپی)، راجستھان، بھیواڑی، ہریانہ کے فریدآباد، جند، ہسار، فتح آباد، بھنڈواری، گروگرام، یمنانگر، روہتک، دھروہیرا اور بہار کا مظفرپور ہے۔رپورٹ کے مطابق دنیا کا سب سے زیادہ آلودہ شہر چین کا ژنجیانگ ہے،جس کے بعد ہندوستان کے ۹ شہروں کا نمبر ہے۔ غازی آباد دنیا کا دوسرا انتہائی آلودہ شہر ہے۔اس جائزہ میں دنیا کے ۱۰۶ ممالک کو شامل کیا گیا تھا۔

(اعتماد،حیدرآباد،ص ۵، ۱۷/ مارچ ۲۱ء)

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب میرٹھ

۴۲۹-عیدگاہ

میرٹھ

مکرمی ایڈیٹر صاحب! سلام مسنون

معارف فروری ۲۰۲۱ء کے شمارے کا اداریہ پڑھا جو مسلم حکمرانوں کی بے حسی پر لکھا گیا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ پچاسوں مسلم ممالک کے سربراہوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے خطاب پر دنیا ہمہ تن گوش ہوجائے۔

آپ کے اس سوال کا جواب بھی اداریے کے آخر میں دیا گیا جو حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبے کی آخری دوسطروں میں مضمر ہے ''جو قوم جہاد فی سبیل اللہ ترک کردیتی ہے اس کو خدا ذلیل وخوار کردیتا ہے''۔

اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کررہا ہوں، میرا یہ خط تھوڑا طویل ہے لیکن میں اپنی بات کو رکھنے کے لیے آپ ہی کی طرح ۱۵۰۰/سال پہلے کا واقعہ لکھ رہا ہوں۔

پانی کے ایک چشمے کے قضیے پر حارث بن المصطلق کے مقام پر ایک تنازعہ ہوا اور حضورؐ کو فتح حاصل ہوئی، ابھی مسلمانوں کا لشکر اسی پانی کی جگہ پر جمع تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آ گیا، ایک مہاجر اور ایک انصاری میں اسی پانی پر باہم جھگڑا ہوگیا اور نوبت قتل وقتال کی آ گئی، مہاجر نے اپنی مدد کے لیے مہاجرین کو پکارا اور انصاری نے انصار کو پکارا، دونوں طرف کے کچھ افراد پہنچ گئے اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے بیچ ایک فتنہ کھڑا ہوجاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی خبر ملی تو آپؐ فوراً ادھر تشریف لے گئے اور سخت ناراضگی کے ساتھ فرمایا: یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے، وطن اور قومیت کو بنیاد بنا کر امداد کا معاملہ ہونے لگا اور فرمایا: اس نعرے کو چھوڑو، یہ بدبودار نعرہ ہے، حضورؐ کا یہ ارشاد سنتے ہی جھگڑا ختم ہوگیا اور سب آپس میں گلے مل گئے۔

منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے دشمنی رکھتا تھا مگر دنیاوی فائدے کی خاطر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، اس کو جب مہاجرین اور انصار کے تصادم کی خبر ہوئی تو اس نے

منافقین کو جمع کیا، انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکایا اور کہنے لگا کہ تم نے ان کو اپنے وطن میں بلا کر اپنے سروں پر مسلط کیا، اپنی جائداد اور مال ان کو تقسیم کرکے دے دیے، یہ تمہاری روٹیوں پر پلے ہوئے تمہارے ہی مقابلے پر آئے ہیں، اگر تم نے اب بھی اپنے انجام کو نہیں سمجھا تو آگے یہ تمہارا جینا مشکل کردیں گے، اس لیے تم آئندہ ان کی مدد نہیں کرو، یہ خود ہی ادھر ادھر بھاگ جائیں گے۔

بنی المصطلق میں پیش آنے والا ایک انصاری اور مہاجر کا جھگڑا جاہلیت کا وہ بت تھا جسے حضورؐ نے توڑ دیا تھا اور کہیں کا بھی رہنے والا ہو، کسی رنگ وزبان اور کسی نسل وقوم کا ہو، سب کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا، آپؐ کا قول تھا جو شخص عدل، انصاف اور نیکی پر ہے اس کی مدد کرو، اگرچہ وہ نسب وخاندان اور زبان ووطن میں تم سے الگ ہو اور جو شخص کسی گناہ اور ظلم پر ہو اس کی ہرگز مدد نہ کرو۔

یہی وہ اسلامی برادری اور ایمانی اخوت تھی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں مشرق ومغرب، جنوب، شمال، کالے، گورے، عرب، عجم کے بے شمار افراد کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، جس کی طاقت کا مقابلہ دنیا کی قومیں نہیں کرسکیں لیکن شیطان کب خاموش رہنے والا تھا، شیطان نے مسلمانوں کی عظیم ترین ملت واحدہ کو ملک، وطن اور رنگ، نسب اور خاندان کے مختلف ٹکڑوں پر تقسیم کرکے انہیں باہم ٹکرا دیا، اس طرح دشمنانِ اسلام کی یلغار کے لیے میدان صاف ہوگیا، جس کا نتیجہ آنکھیں آج دیکھ رہی ہیں کہ مشرق ومغرب کے مسلمان جو ایک قوم اور ایک دل تھے، اب چھوٹے چھوٹے گروہوں میں ہوکر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور ان کے مقابلے کفر کی طاغوتی طاقتیں باہمی اختلاف رکھنے کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں ملت واحدہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔

افسوس ہے کہ زمانہ دراز سے مسلمان اپنے اس سبق کو بھول گئے اور دشمنوں نے مسلمانوں کی اسلامی وحدت کے ٹکڑے کرنے میں پھر وہی شیطانی جال پھیلا دیا اور دین واصول دین کی غفلت کی بنا پر عام دنیا کے مسلمان اس جال میں پھنس کر باہمی خانہ جنگیوں کے شکار ہوگئے اور کفر والحاد کے مقابلے کے لیے ان کی متحدہ طاقت پاش پاش ہوگئی، صرف عربی وعجمی ہی نہیں عربوں میں مصری، شامی، حجازی، یمنی متحد نہیں رہے، نتیجتاً ان لوگوں نے ڈیڑھ اینٹ کی عمارت کھڑی کرکے دولت وثروت کو گلے لگا کر تاعمر حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، ان لوگوں کو نہ تو ملک سے محبت ہے اور نہ عوام سے اور نہ ہی اسلامی برادری سے، انہیں صرف دولت اور اپنی جان سے پیار ہے، اگر کسی بھی ملک پر اغیار کا

حملہ ہوتا ہے یا کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے تو کسی بھی ملک کے سربراہ کو احتجاج کرنے یا ان کی مدد کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، اب ذرا غور کریں یہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ اپنے کسی بھی خطاب سے دنیا کو اپنی طرف کس طرح راغب کر سکتے ہیں۔

خود ہمارے ملک میں مسلمان پٹھان، شیخ اور طرح طرح کی برادریوں کا شکار ہو گئے، اسلام کے دشمن ہماری کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ہر میدان میں ہم پر غالب آ گئے ہیں اور ہم ہر جگہ شکست خوردہ غلامانہ ذہنیت میں مبتلا انہیں کی پناہ لینے پر مجبور نظر آتے ہیں، کاش آج بھی مسلمان اپنے قرآنی اصول اور اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر غور کریں اور اس پر عمل کریں، غیروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اسلامی برادری کو مضبوط بنالیں تو آج اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کا مشاہدہ کھلی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

(جناب) ایس۔ایم۔خان
موبائل: ۹۴۵۸۴۰۱۸۸۴

مکتوب کاندھلہ

۲۲؍رجب ۱۴۴۲ھ

محترم ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

معارف میں اشاعت کے لیے اپنی ایک تحریر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تصانیف وغیرہ ارسال ہے جو دراصل میری ایک زیر تالیف کا ایک باب ہے۔ امید کہ معارف کے قریب ترین شمارہ میں شامل اشاعت ہو سکے گا، اگرچہ یہ مضمون کسی قدر طویل ہے۔ شاید چار یا پانچ قسطوں میں مکمل ہو، مگر ان شاء اللہ تعالیٰ مفید اور علم افزا ہوگا، رسید سے مطلع فرمائیے، میں آج کل کالاموتیا کی وجہ سے بینائی سے بہت متاثر ہوں اس لیے تحریر بھی ایسی ہی ہے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

(جناب) نورالحسن راشد کاندھلوی
موبائل: ۹۴۵۸۴۰۱۸۸۴

ادبیات

نعت

پروفیسر محمد حیات عامر حسینی

اے نگاہِ مصطفیٰؐ جان کرم — اے سراپا رحمت و روح امم
تو کہ جادہ آگہی رقص حیات — اے محیط ساز رقص کائنات
تو کہ ساز گردش جوئے شمیم — تو کہ ناز و محور بوئے شمیم
تو کہ جان عنبریں مشک ارم — تو کہ رمز ضوفشاں لوح و قلم
تو کہ ساز بربطِ نظمِ حیات — معنیٔ بزم حدیث کائنات
ساغر و خم خانۂ صدق و صفا — مصدر و پیمانۂ رشد و شفا
من غریبم بے نوا و بے صدا — تو رئیس جاوداں جان عطا
پاسِ للہ یک نظر برحالِ ما — گوش بر آوازِ ما احوالِ ما

نعت

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی☆☆

نبی محبوبِ ربّ دوجہاں ہیں — وہی خوش رنگیِ کون ومکاں ہیں
کلیدِ کامرانی ذات ان کی — کہ وہ دارین کی دولت گراں ہیں
عرب کے کافر و مشرک بتاتے — کہ وہ مفتوح کے حق میں اماں ہیں
نگاہوں سے عطا روشن دلی کی — امامِ اولیا و عارفاں ہیں
مقام ان کا سمجھ سے بالاتر ہے — کہ وہ دستارِ فرقِ کاملاں ہیں
بیاں بھی امّ معبد کا ہے ایسا — فصاحت سے بھری یکسر زباں ہیں
وہی خلق عظیم ہیں بھی مناظر — وہی امت پہ اپنی مہرباں ہیں

☆جعفری باغ، جلال پور، فیض آباد (یوپی)، موبائل: ۹۴۵۲۶۵۲۴۸۸۔ ☆☆شعبۂ فلاسفی، اے، ایم، یو، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

عبدالماجد دریابادیز تفسیر القرآن، اے کریٹکل اسٹڈی، ترتیب از جناب گوہر قادر روانی اور عبدالقادر چوغلے، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۵۸، قیمت ۶۰۰ روپے، پتہ: کے۔اے نظامی سینٹر فار قرآنک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی کی ایک پہچان لفظ انفرادیت سے بھی ہوتی ہے، قلم موضوع، علم، اسلوب اور جذبہ ان کا متنوع رہا، اور فلسفہ، تذکرہ، ادب، انشا، ہر جگہ ان کو مقام انفرادیت اس طرح حاصل ہوا کہ اردو کے نہایت باکمال اہل قلم کی سب سے نمایاں صف میں ہمیشہ کے لیے ان کا نام ثبت ہوگیا، لیکن ان کے علم و معلومات کا اصل محور علوم قرآنی یا قرآنی مطالعہ ہی تھا، مولانا کو تفسیر قرآن کی سعادت ملی تو اہل نظر کی نظر میں ایسی انفرادیت کی حامل ہوئی جس کو مختصر ترین لفظوں میں بتایا گیا کہ اس تفسیر سے ایک عصری علوم کا حامل، ایک عام ثقافت کا مالک اور علوم دینیہ کا ایک طالب علم سب ہی کو یکساں فائدہ حاصل ہوتا ہے، تفسیر ماجدی کی خصوصیات پر کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا، ان کی انگریزی تفسیر کی افادیت کا اردو ہی کی طرح اقرار کیا گیا اور صحیح کہا گیا کہ قرآنی آیات اور تورات و انجیل کا تقابلی مطالعہ گرچہ پہلے بھی کیا گیا مگر اگلوں میں اور مولانا میں فرق یہی ہے کہ پہلے انداز مدافعانہ تھا، مولانا نے بڑھ کر تحریف شدہ صحائف کا کھوکھلا پن بھی دکھا دیا، مولانا کی تفسیری انفرادیت پر سب سے اچھا مضمون مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم کا ہے، اسی طرح اردو میں بعض تحریریں تفسیر ماجدی کے مطالعہ کا اچھا نمونہ ہیں، ان تحریروں اور کچھ تازہ مضامین کو زیر نظر مجموعہ مقالات کو انگریزی میں یکجا کیا گیا ہے، اس طرح انگریزی داں طبقہ کے لیے تفسیر ماجدی کی اہمیت، خصوصیت و افادیت اور زیادہ احسن طریق پر سامنے آگئی، مرتبین میں عبدالقادر چوغلے کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے اور جناب وانی مسلم یونیورسٹی کے نوخیز اور ہونہار اسکالر ہیں، مترجمین میں بھی حنیفہ بلال، محمد عرفان شاہ، مشتاق الحق احمد سکندر کا تعلق علی گڑھ و کشمیر سے ہے، یہ سب ایک عمدہ قرآنی خدمت کے لیے لائق تحسین ہیں اور سب سے بڑھ کر اس پوری محنت و کاوش میں شریک پروفیسر عبدالرحیم قدوائی داد و تبریک کے قابل ہیں جن کی مسلسل کوششوں سے قرآنیات کے مطالعہ کے لیے خدا جانے کتنے گوشے وا اور روشن ہوتے جاتے ہیں۔

منظوم تاریخ خاندان از حکیم سید ظل الرحمٰن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش،

صفحات ۱۲۰، قیمت ۱۷۵ روپے، پتہ: ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

خاندانوں کی تاریخ محفوظ رکھنے اور آباءواجداد کے ناموں کا ورد کرنے کا شوق کئی عمدہ روایات کی طرح اب کم یا ختم ہوتا جا رہا ہے، شجرے رکھنے اور اس میں اضافوں کا عمل اب پہلے جیسا کہاں، لیکن خاندانی فخر و مباہات کے بیانیہ سے قطع نظر اس کو صرف خاندان ہی نہیں ماضی کی مذہبی، علمی اور ثقافتی تاریخ کا ایک عمدہ اور اہم ماخذ کی حیثیت سے بھی دیکھا جانا چاہیے، اس کتاب کی اشاعت میں شاید یہی وجہ شامل ہے، فاضل مولف کو غرائب و نوادر کے جمع کرنے کا وہ شوق ہے جو کم ہی کی قسمت میں آتا ہے، اسی شوق نے ابن سینا اکاڈمی کو علی گڑھ کے امتیازات کی فہرست میں نمایاں جگہ عطا کردی اور اب یہ کتاب بھی جو بظاہر ایک خاندان کی تاریخ ہے لیکن دوسروں کے لیے اس میں دلچسپی کا سامان یوں ہے کہ قریب ساڑھے چار سو برس کی مدت میں ایک خاندان کی تاریخ منظوم آثار و مندرجات کے ذریعہ پیش کی گئی، اس سے کسی خاندان کا علم سے رشتہ ہونے اور مسلسل استوار ہونے کی قابل فخر روایت سے واقفیت تو ہوتی ہی ہے ایک چھوٹے سے قصبہ کی تصویر میں کئی صدیوں کی سماجی زندگی اور تہذیب کے بننے بگڑنے کے نقوش و خطوط بھی واضح ہوتے ہیں، مثلاً تجارہ کے محلہ قاضی واڑہ کی مسجد کی تاریخ بنا و تعمیر اکبر کے دور میں کی گئی، جس سے خود اکبر کا تعارف یوں ہوتا ہے کہ ؎

بدور شہ اکبر دین پناہ بنا گشت ایں مسجد خوب تر

قاضی محمود کی وفات ۱۵۹۶ء میں ہوئی تو ان کے لیے تاریخ وفات میں یہ مصرعہ اس دور کی خبر بھی سناتا ہے کہ ؎

قاضی القضاۃ محمود آں کہ در دین خدا صدق را صدیق بود و عدل را ثانی عمر

یہ سلسلہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ ایک ہی خاندان میں ولادت و وفات، شادی اور پھر مسجد، مقبرے، مکانوں اور حویلیوں کی منظوم تاریخ کا سلسلہ چار سو برسوں سے کس شان سے جاری ہے، تجارہ آج حکیم صاحب اور کئی اہل علم و قلم کی نسبتوں سے جانا جاتا ہے، لیکن اس راجپوتانی قصبہ پر ۱۹۴۸ء میں کیا گزری، اس کا حال شہر آشوب کے عنوان سے پروفیسر سید سلیم کی زبانی ہے اور اس طرح

ہے کہ تقلیب لیل و نہار میں پوشیدہ عبرت اولی الابصار کے لیے عیاں ہو جاتی ہے، صبح آزادی سے پہلے شام بسمل کا سماں بھی کیا تھا ؎

قتل و خوں خانہ بہ خانہ اور تعقب تا بکوہ فوج الور سنگ دل تھی، بھیڑیوں کا اک گروہ

لیکن تجارہ والوں کا حوصلہ کم نہ ہوا، کیونکہ یقین تھا کہ ؎

مدتوں دست زمانہ ناشناس و بے وفا محو کرسکتا نہیں تہذیب مسلم دل کشا

تجارہ کی یہ منظوم تاریخ محض ایک خاندان کی عظمت کا قصیدہ نہیں، اس کے پردے میں ہندوستان کی اسلامی تہذیب کی ایک جھلک بھی ہے، اس کتاب کی ضرورت اسی وجہ سے جائز و مستحسن ہے۔

حروف بازگشت از مولانا کلیم صفات اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۴، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: دارالمصنّفین شبلی اکاڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۱۹، اعظم گڑھ (یوپی)

دارالمصنّفین کی بعض دلچسپ روایات میں گورکھپور ریڈیو اسٹیشن سے تعلق بھی ہے، اس اسٹیشن کے قیام سے آکاش وانی ہونے تک دارالمصنّفین کے رفقا اور متعلقین بھی اس سے وابستہ رہے اور پراز معلومات اور عصری تقاضوں کے لحاظ سے مفید اور کارآمد موضوعات پر ان کے نشریے فضاؤں میں بکھرتے رہے، ان ہی میں مولانا کلیم صفات اصلاحی رفیق دارالمصنّفین بھی شامل ہیں جن کی تقریریں ریکارڈنگ روم سے نکل کر عام سامعتوں کو شادکام کرتی رہیں۔

اب زیر نظر مجموعہ میں ان نشریوں کو سلیقہ سے جمع کردیا گیا، نشریات عموماً دس پندرہ منٹ کی ہوتی ہیں اس لیے یہ تین چار صفحات ہی میں محدود رہتی ہیں، ایسے اختصار میں جامعیت کی خوبی ضروری ہے اور یہ اس کتاب میں پوری طرح ظاہر ہے، سننے والا ہو یا اب پڑھنے والا ہو، اس کو مواد سے تشنگی کا شکوہ بھی نہیں رہتا، قریب بائیس تیئس عنوانات کے تحت معلومات کی ایک دنیا آگئی ہے، مقدمہ بھی خوب ہے جس میں ریڈیو اور ریڈیائی لہروں پر دلچسپ بحث ہے اور جس کا خاتمہ اس نظریہ کے انکشاف پر ہوا کہ اس کی ایجاد کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی کا کہنا بجا ہے کہ ہر تقریر دریا نہیں بلکہ سمندر بکوزہ کی مصداق ہے، اردو کے نشریاتی ادب میں یہ کتاب واقعی بڑا خوبصورت اضافہ ہے۔

(ع ۔ ص)

رسید کتب موصولہ

ارتعاش: محمد سمیع رہبر تابانی دریابادی، بزم افقر بارہ بنکی قیمت ۲۵۰ روپے

اردو میں ناول نگاری کی روایت اور گئودان: فاطمہ خاتون مغربی بنگال اردو اکادمی

قیمت ۹۸ روپے

چٹھی آئی ہے: ترتیب شاہد اقبال، بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ قیمت ۵۰۰ روپے

ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ

قیمت ۱۵۰ روپے

رباعیات: سلمان احمد، دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ قیمت ۳۰۰ روپے

قرآنی معاشیات: پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ

قیمت ۳۰۰ روپے

مجالس علم و عرفاں: مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری، مکتبہ احسان، لکھنؤ قیمت درج نہیں

مجلس میلاد مصطفیٰ: ترجمہ ارشاد عالم نعمانی، رسول اعظم اکیڈمی، ۱۹/۲۱ ـ نیو عیدگاہ کالونی، کانپور

قیمت دعائے خیر

مسلم خواتین کے معاشی و سماجی حقوق و اختیارات: ڈاکٹر تمنا مبین اعظمی، ماڈرن اسٹیشنری اینڈ پرنٹ سولوشن، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی قیمت ۲۶۰ روپے

نعتیں (شعری مجموعہ): سلمان احمد، دانش محل، جھنڈے والا پارک، امین آباد، لکھنؤ

قیمت ۳۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعرالعجم اول	300/-
شعرالعجم دوم	150/-
شعرالعجم سوم	125/-
شعرالعجم چہارم	200/-
شعرالعجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
APRIL 2021 Vol - 207 (4)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-